تدبر لاہور

جاری کردہ :

مولانا امین احسن اصلاحی

مدیر:

خالد مسعود

یکے از مطبوعات

اِدارۂ تدبرِ قرآن و حدیث

لاہور۔ پاکستان

تدبّر
لاہور

جاری کردہ
مولانا امین احسن اصلاحی
مُدیر:
خالد مسعود

شمارہ 67
مارچ 2000ء
ذوالحجہ 1420ھ

مجلس ادارت
عبداللّٰہ غلام احمد
ماجد خاور
محبوب سُبحانی
سعید احمد

قیمت 12.50روپے
سالانہ 50.00روپے
بیرون ملک 250.00روپے
(ماسوائے برصغیر)

فہرست

تذکرہ و تبصرہ
ملی نقصان — خالد مسعود — 3
تدبر حدیث
کتاب الصوم۔ صحیح بخاری — 5
امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی
درس موطا امام مالک — 15
امین احسن اصلاحی / سعید احمد
مقالات
مولانا اصلاحی کی علمی خدمت — 24
خالد مسعود
قیامت کی ضرورت — 46
محبوب سبحانی

ناشر: ادارہ تدبر قرآن وحدیث رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہور

نئی اشاعت

تفسیر قرآن کے اصول

تالیف :- امام حمید الدین فراہیؒ — ترجمہ و ترتیب :- خالد مسعود

موضوعات

1- قرآن میں تدبر و تفکر کی اہمیت
2- قرآن مجید کی ترتیب
3- قرآن۔ ایک مربوط و منظم کتاب
4- اصول تفسیر کو مدون کرنے کی ضرورت
5- اصول تفسیر سے متعلق چند تمہیدی مباحث
6- تفسیر قرآن کے اصول
7- اصول تاویل

قیمت -/80روپے

اصول فہم قرآن

مصنف :- مولانا امین احسن اصلاحی — ترتیب :- عبداللہ غلام احمد

موضوعات

- فہم قرآن کے لیے چند بنیادی اصول
  1- قرآن مجید کی دعوت عقل و فطرت پر مبنی ہے۔
  2- قرآن مجید کی ترتیب اتفاقی نہیں بلکہ توقیفی ہے۔
  3- قرآن حق و باطل کے امتیاز کے لیے کسوٹی ہے
  4- قرآن مجید قریش کی ٹکسالی عربی زبان میں نازل ہوا۔
  5- قرآن قطعی الدلالہ ہے۔
- نسخ اور اس کی حکمت
- حکمت قرآن کے فہم کے لیے اساس

قیمت -/34روپے

اسباق النحو

مصنف :- خالد مسعود

- امام فراہیؒ کی کتاب پر مبنی نئی ترتیب کے ساتھ
- عربی زبان کے قواعد کی تعلیم کا جدید انداز
- اسم، فعل اور حرف کا ضروری تعارف
- ترجمہ کے لیے مشقیں

قیمت -/36روپے

"میرے نزدیک یہ کتاب طلبہ فن کے لئے کافی ہے۔ اس سے عربی زبان عربی زبان سیکھنے کی راہ باز ہو جائے گی" ۔ مولانا امین احسن اصلاحی

ملنے کا پتہ

1- ادارہ تدبر قرآن و حدیث۔ رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی سمن آباد، لاہور۔
2- دار التذکیر۔ رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور۔

تذکرہ و تبصرہ

خالد مسعود

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ملی نقصان

جمعہ، ۲۲ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ کو عالم اسلام کے نامور عالم و دینی رہنما مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنی مہلت حیات پوری کر کے اپنے رب سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی شخصیت بے حد فعال، عالم اسلام کے مسائل پر نظر رکھنے والی، مغربی تہذیب کی فتنہ سامانیوں سے آگاہ اور ہر علاقہ کے مسلمانوں کے لیے درد دل رکھنے والی تھی۔ ان کا مقام و مرتبہ برصغیر پاک و ہند ہی میں نہیں بلکہ عرب دنیا میں، نیز یورپ اور امریکہ میں، ایک جلیل القدر عالم دین اور مبلغ اسلام کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے دینی ادارے، اسلامی یونیورسٹیاں اور سوسائٹیاں ان سے رہنمائی اور مشاورت سے بے نیاز نہ تھیں۔ ہر قابل قدر کام میں مسلمان ان کی شرکت کے متمنی ہوتے۔ مولانا علی میاں کا نام اسلام کی سربلندی اور اصلاح قوم و ملت کے ساتھ یوں وابستہ ہو گیا تھا کہ یہ دونوں لازم و ملزوم بن گئے۔

مسلم امہ قحط الرجال کا شکار ہے اور دور حاضر میں مولانا علی میاں جیسے قابل و ہر دلعزیز رجال کا اٹھ جانا ایک غیر معمولی ملی نقصان ہے۔ کیونکہ ایسی ہستیوں کا فیض اپنے خانوادے تک محدود نہیں ہوتا بلکہ پوری امت ان سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ مزید براں نئے لوگ ان کی جگہ لینے سے قاصر رہتے ہیں۔ ادارہ تدبر قرآن و حدیث دعا گو ہے کہ مولانا کی خدمات دینی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شرف قبولیت پائیں اور ان کے لیے توشہ آخرت بنیں اور اللہ تعالیٰ ان کو آخرت میں بلند درجات سے نوازے۔

امین احسن میموریل لیکچر

دینی کتب کے اشاعتی ادارہ دار التذکیر (اردو بازار لاہور) نے استاذ گرامی مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی یاد تازہ رکھنے اور ان کی علمی خدمات سے قوم کو آگاہ رکھنے کے لیے ہر سال مولانا کے لیے ایک

میموریل لیکچر منعقد کرانے کا پروگرام بنایا ہے۔ پہلے لیکچر کے لیے انھوں نے راقم کا نام تجویز کیا اور صدارت کے لیے پروفیسر ڈاکٹر محمود احمد صاحب غازی سے درخواست کی جو اس وقت حکومت پاکستان کی قومی سلامتی کونسل کے ایک رکن کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ محترم غازی صاحب اپنی مصروفیات میں سے اپنا قیمتی وقت نکال کر اسلام آباد سے لاہور تشریف لائے اور جلسہ کی صدارت فرمائی۔ یہ جلسہ ۲ فروری ۲۰۰۰ء کو قائداعظم لائبریری کے ہال میں منعقد ہوا۔ تقریباً دو سو اہل علم نے اس میں شرکت کی اور کمال انہماک سے راقم کا لیکچر اور صدر محترم کی تقریر سنی۔ لیکچر تدبر کے اسی شمارہ میں شائع کیا جارہا ہے۔ جسے قارئین بتمام و کمال ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ صدر محترم کی تقریر فی البدیہہ تھی جسے قلمبند نہ کیا جا سکا۔ انھوں نے مولانا اصلاحیؒ کے تبحر علمی اور قرآن مجید کے ساتھ شغف کا تذکرہ کرتے ہوئے جاں ارشاد فرمایا مولانا کی خدمت میں کم یا زیادہ وقت تک بیٹھنے والا ہر شخص قرآن سے محبت کا درس لے کر اٹھتا اور حسب توفیق فائدہ اٹھاتا تھا۔ انھوں نے مولانا کی اپنے مشن کے ساتھ لگن کے بارے میں اپنا احساس بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ مولانا محترم نے اپنی زندگی کا کوئی دور خدمت قرآن کے حوالے سے رائیگاں نہیں جانے دیا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جماعت اسلامی کی سترہ سال کی وابستگی نے ان کو اپنے مقصد زندگی سے دور کر دیا تھا لیکن یہ رائے صحیح نہیں۔ مولانا نے سترہ سال تو کیا، سترہ مہینے یا سترہ دن یا سترہ گھنٹے بلکہ سترہ منٹ اور سترہ سیکنڈ بھی اپنے ہدف کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ وہ برابر قرآن پر تدبر کرتے اور اس کی حکمتوں کو تحریر اور تقریر کے ذریعے واضح فرماتے رہے۔ مولانا مودودیؒ کے ساتھ ان کے اختلاف کو بھی اس طور سے لینا چاہیے جیسے دو جرنیل کسی جنگی حکمت عملی میں مختلف الرائے ہو جاتے ہیں۔ یہ اختلاف محض طریق کار کا اختلاف ہوتا ہے، اس کو حق و باطل کا اختلاف نہیں سمجھا جاتا۔

دارالتذکیر نے میموریل لیکچر باقاعدگی سے منعقد کرنے کا جو عندیہ ظاہر کیا ہے وہ بڑا ہی مبارک ہے۔ ان شاء اللہ یہ مولانا کی خدمات دینی کو ذہنوں میں تازہ رکھنے کا باعث بنے گا اور اس کے نتیجہ میں آگے چل کر قرآن کی خدمت کے مزید امکانات سامنے آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ منتظمین کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اس سلسلہ کو باقاعدگی سے جاری رکھنے کی توفیق سے نوازے۔

مولانا امین احسن اصلاحی

کتاب البیوع، صحیح بخاری

باب ۱۳۱۹-اذالم یوقت فی الخیار هل یجوز البیع
باب اس بات کے بیان میں کہ جب خیار کا وقت معین نہیں تو کیا بیع جائز ہوگی۔

۱۹۸۰- حدثنا ابو النعمان حدثنا حماد بن زید حدثنا ایوب عن نافع عن ابن عمر قال النبی ﷺ البیعان بالخیار مالم یتفرقا او یقول احدهما لصاحبه اختر و ربما قال او یکون بیع خیار-

ترجمہ: ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ دونوں خرید و فروخت کرنے والے جب تک الگ الگ نہ ہو جائیں خیار رکھتے ہیں یا یہ کہ ان میں سے ایک اپنے دوسرے ساتھی سے کہے کہ آپ کو اختیار ہے- کبھی آپ نے یہ کہا کہ یا یہ کہ بیع خیار ہو-

وضاحت: امام صاحب نے باب تو یہ باندھا ہے کہ اگر وقت مقرر نہیں کیا ہے تو بیع جائز ہوگی یا نہیں، لیکن اس کے تحت جو روایت لائے ہیں اس میں وہی بات ہے جو اوپر والی روایت میں گزری ہے- مالم یتفرقا سے وقت تو متعین ہو گیا- اور جب ایک ساتھی نے دوسرے کو اختیار دے دیا تو اس اختیار دینے میں یہ بات مضمر ہوتی ہے کہ آپ چیز لے جائیے- ایک دن دو دن بعد اگر کچھ نقص نظر آئے تو واپس کر دیجئے- یہ بات سمجھی جاتی ہے اور اس بنیاد پر بیع ہو جاتی ہے اور وقت بھی متعین ہوتا ہے البتہ منٹ اور گھنٹے کا حساب نہیں ہوتا-

عنوان باب میں دیے گئے سوال کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ بیع ہو جائے گی البتہ معروف کے مطابق، رواج اور دستور کے مطابق وقت کا تعین کر دیا جائے گا-

باب ۱۳۲۰- البیعان بالخیار مالم یتفرقا وبه قال ابن عمر و شریح و الشعبی و طاؤس و عطاء و ابن ابی ملیکة

ترجمہ: بائع اور مشتری دونوں کو اختیار ہے جب تک جدا نہ ہوں۔ ابن عمرؓ، شریح، الشعبی، طاؤس، عطاء و ابن ابی ملیکہ کا یہی قول ہے۔

یہ تو ساری دنیا نے کہا ہے اور ٹھیک کہا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ کیا اس طریقہ پر عمل بھی ضروری ہے جو ابن عمرؓ سے منسوب ہے۔ تو میری رائے میں یہ غیر ضروری سی چیز ہے۔ عرف عام میں جب آپ موقع بیع سے اٹھ جاتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خیار ختم ہو گیا۔ اس میں کسی قسم کے تکلف کی ضرورت نہیں۔ بائع کو بھی اختیار ہونا چاہیے۔ جس طریقہ کی زحمت آپ کو پیش آسکتی ہے اس طریقہ کا تردواے بھی ہو سکتا ہے۔

۱۹۸۱- حدثنی اسحاق اخبرنا حبان حدثنا شعبة قال قتادہ اخبرنی عن صالح ابی الخلیل عن عبداللہ بن الحارث قال سمعت حکیم بن حزام عن النبی ﷺ قال البیعان بالخیار مالم یتفرقا فان صدقا و بینا بورك لهما فی بیعهما و ان کذبا و کتما محقت برکة بیعهما-

ترجمہ: حکیم بن حزام نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ خرید و فروخت کرنے والے دونوں اپنی بیع کو نافذ کرنے یا منسوخ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اس وقت تک جب تک کہ جدا نہ ہوں۔ اگر وہ اپنے معاملہ میں سچ بولیں گے اور جو نقص ہے بیان کریں گے تو ان کی بیع میں برکت ہو گی اور جھوٹ بولیں گے اور خرابی چھپائیں گے تو برکت مٹ جائے گی۔

وضاحت: برکت اٹھنے کا مطلب بیان کر چکا ہوں کہ لاکھوں کا منافع ہوتا ہے لیکن دوسری طرف سے سرنگ لگ جاتی ہے اور زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ نہ جانے کتنے پہلوؤں سے وہ چیز آدمی کے لیے فتنے کا باعث بن جاتی ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ برکت دے تو بہت تھوڑے میں بڑے بڑے کام ہو جاتے ہیں۔ اس برکت کی کوئی حد نہیں ہے۔

۱۹۸۲- حدثنا عبداللہ بن یوسف اخبرنا مالك عن نافع عن عبداللہ بن عمر ان رسول اللہ ﷺ قال المتبایعان کل واحد منهما بالخیار علی صاحبه مالم یتفرقا الا بیع الخیار-

ترجمہ: عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بائع اور مشتری دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل میں اختیار ہے جب تک جدا نہ ہوں سوائے بیع خیار کی صورت میں۔

وضاحت: یہاں الفاظ کل واحد منهما آئے ہیں۔ یعنی بائع اور مشتری دونوں میں سے ہر ایک کو اختیار ہے۔ یہ سب روایت بالمعنی کے باعث ہوتا ہے۔ یہ غور کرنا پڑے گا کہ یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے یعنی شریعت کی بات ہے یا کسی راوی صاحب کا اجتہاد ہے۔ حدیثوں میں یہ بحث ہے اور روایت بالمعنی نے مفہوم میں بڑا فرق کر دیا ہے۔

باب ۱۳۲۱- اذا خیر احدهما صاحبه بعد البیع فقد وجب البیع

جب بائع یا مشتری دوسرے کو بیع کے بعد اختیار دے تو بیع لازم ہو گئی

۱۹۸۳- حدثنا قتیبة حدثنا اللیث عن نافع عن ابن عمرؓ عن رسول اللہ ﷺ انه قال اذا تبایع الرجلان فکل واحد منهما بالخیار مالم یتفرقا و کانا جمیعا او یخیر احدهما الاخر فتبایعا علی ذالك فقد وجب البیع و ان تفرقا بعد ان تبایعا ولم یترك واحد منهما البیع فقد وجب البیع-

ترجمہ: ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب دو آدمیوں نے لین دین کیا تو ان میں سے ہر ایک کو اختیار رہتا ہے جب تک کہ جدا نہ ہوں اور اکٹھے رہیں یا یہ کہ ایک نے دوسرے کو اختیار دے دیا اور اس پر دونوں نے معاملہ طے کر لیا تو بیع ہو گئی۔ اگر دونوں لین دین کرنے کے بعد متفرق ہو گئے اور ان میں کسی نے بھی بیع کو چھوڑا نہیں تو بیع واجب ہو گئی۔

باب ۱۳۲۲- اذا کان البایع بالخیار هل یجوز البیع

جب بیچنے والا بھی اختیار رکھتا ہو تو کیا بیع جائز ہو جائے گی

۱۹۸۴- حدثنا محمد بن یوسف حدثنا سفیان عن عبداللہ بن دینار عن ابن عمرؓ عن النبی ﷺ قال بیعین لا بیع بینهما حتی یتفرقا الا بیع الخیار-

ترجمہ: ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بیع کرنے والے دونوں فریقوں کے درمیان بیع نہیں ہے جب تک کہ وہ متفرق نہ ہوں الا آں کہ بیع خیار ہو۔

وضاحت :ان ابواب اور احادیث میں ایک ہی بات دہرائی جا رہی ہے اور وہ بالکل بدیہی بات ہے-

۱۹۸۵-حدثنی اسحاق حدثنا حبان حدثنا همام حدثنا قتاده عن ابی الخلیل عن عبدالله بن الحارث عن حکیم بن حزام ان النبی ﷺ قال البیعان بالخیار مالم یتفرقا قال همام وجدت فی کتابی یختار ثلث مرار فان صدقا و بینا بورك لهما فی بیعهما و ان کذبا و کتما فعسی ان یربحا ربحا و یمحقا برکة بیعهما- قال و حدثنا ابوالتیاح انه سمع عبدالله بن الحارث یحدث بهذا الحدیث عن حکیم بن حزام عن النبی ﷺ-

ترجمہ : حکیم بن حزام روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بائع اور مشتری دونوں کو اختیار ہے جب تک جدا نہ ہوں- ہمام کہتے ہیں کہ میں نے اپنی کتاب میں یوں لکھا پایا تین بار اختیار کرے- پھر اگر وہ دونوں سچ بولیں گے اور جو عیب ہو بیان کریں گے تو ان کی بیع میں برکت ہو گی اور اگر جھوٹ بولیں گے اور عیب کو چھپائیں گے تو تھوڑا سا نفع شاید کما لیں لیکن ان کی بیع میں برکت نہیں ہو گی-

وضاحت :اس روایت میں ایک بات غور طلب ہے وہ یہ کہ ہمام کی اس بات کا کیا مطلب ہے کہ تین بار اختیار کرے- کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کہے میں نے دیا میں نے دیا تین بار اور دوسرا کہے میں نے لیا میں نے لیا- بہر حال میں اس کے سمجھنے سے قاصر ہوں-

باب ۱۳۲۳- اذا اشتری شیئا فوهب من ساعته قبل ان یتفرقا و لم ینکر البایع علی المشتری اواشتری عبدا فاعتقه و قال طاؤس فیمن یشترالسلعة علی الرضا ثم باعها و جبت له والربح له و قال الحمیدی حدثنا سفیان حدثنا عمرو عن ابن عمر قال کنا مع النبی ﷺ فی سفر فکنت علی بکر صعب لعمر فکان یغلبنی فیتقدم امام القوم فیزجره عمر و یرده فقال النبی ﷺ لعمر بعنیه قال هو لك یا رسول الله (ﷺ) قال بعنیه فباعه من رسول الله ﷺ فقال النبی ﷺ هو لك یا عبدالله بن عمر تصنع به ما شئت - قال ابو عبدالله و قال اللیث حدثنی عبدالرحمن بن خالد عن ابن شهاب عن سالم بن عبدالله عن عبدالله بن عمرؓ قال بعت من امیر المومنین عثمان مالا بالوادی بمال له بخیبر فلما تبایعنا

رجعت علی عقبی حتی خرجت من بیته خشیة ان یراد فی البیع و کانت السنة ان المتبایعین بالخیار حتی یتفرقا قال عبدالله فلما وجب بیعی و بیعه رایت انی قد غبنته بانی سقته الی ارض ثمود بثلث لیال و ساقنی الی المدینة بثلث لیال-

ترجمہ :اگر کوئی شخص کوئی چیز خرید کر اسی وقت کسی اور کو ہبہ کر دے جب کہ ابھی بائع سے جدا بھی نہ ہوا ہو اور بائع مشتری پر اعتراض نہ کرے، یا ایک غلام خریدے اور جدا ہونے سے پہلے اس کو آزاد کر دے- اور طاؤس نے کہا جو کوئی کچھ سامان خریدے بائع کی رضامندی سے اور پھر اس کو بیچ ڈالے اور بائع انکار نہ کرے تو ان صورتوں میں بیع لازم ہو جائے گی اور نفع خریدار ہی کو ملے گا- اور ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک سفر میں ہم آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے- میں ایک جوان اونٹ پر سوار تھا جو حضرت عمرؓ کا تھا- وہ مجھ سے بے قابو ہو کر لوگوں سے آگے بڑھ جاتا تھا اور حضرت عمرؓ اس کو جھڑکتے اور پیچھے پھیر دیتے تھے- آخر آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا اس کو میرے ہاتھ بیچ دیجئے- انہوں نے کہا مفت لے لیجئے- آپ نے فرمایا قیمت سے دیں- حضرت عمرؓ نے وہ اونٹ آپ کے ہاتھ بیچ ڈالا- آنحضرت ﷺ نے فرمایا عبداللہ بن عمر! یہ اونٹ تم لے لو اور جو چاہو سو کرو- اور عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی زمین جو وادی القری میں تھی امیر المومنین حضرت عثمانؓ کے ہاتھ اس زمین کے بدلے بیچی جو ان کی خیبر میں تھی- جب سودا ہو چکا تو میں پیچھے پلٹ کر ان کے گھر سے نکل گیا اس ڈر سے کہ کہیں وہ بیع پھیر نہ لیں اور قاعدہ یہ تھا کہ بائع اور مشتری دونوں کو اختیار ہے جب تک وہ جدا نہ ہوں- عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ جب میری اور حضرت عثمانؓ کی بیع واقع ہو گئی تو میں نے خیال کیا کہ میں نے حضرت عثمانؓ کو ٹھگ لیا ہے کیونکہ میں نے ان کو ثمود کے ملک کی طرف تین دن زیادہ کی مسافت پر دھکیل دیا اور انہوں نے مجھ کو تین دن کا راستہ مدینہ سے کم کر دیا-

وضاحت :یہ بات کہ ایک شخص نے ایک چیز خریدی اور بائع سے جدا ہونے سے پہلے کسی کو ہبہ کر دی اور بائع نے کوئی نکیر نہیں کی یا ایک غلام خریدا اور اس کو فوراً آزاد کر دیا اور بائع نے اس پر بھی کوئی نکیر نہیں کی تو اس شکل میں کیا ہو گا- اس میں بائع کی خاموشی اس کی رضامندی سمجھی جائے گی اور بیع ہو جائے گی- یہ بات قرین عقل ہے اور اس میں کوئی بحث نہیں ہے-

طاؤس کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کوئی چیز خریدتا ہے علی الرضا یعنی راضی خوشی، وہ دینے پر راضی اور یہ لینے پر راضی اور پھر اس کو بیچ دیتا ہے تو نفع بھی وہی لے گا اور بیع بھی ہو جائے گی- مسئلہ کی یہ شکل وہی ہے جو اوپر والی ہے اور ٹھیک ہے- اس میں کوئی اعتراض کی گنجائش نہیں-

ابن عمرؓ کی جو روایت ہے اس بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ اس سے مسئلہ باب کا استنباط زیادتی ہے- بات حضور ﷺ کی ہے- اونٹ حضرت عمرؓ کا ہے- دیا جاتا ہے ابن عمرؓ کو تو یہ سارا معاملہ گھر کا ہے- اس میں کسی کو کسی چیز پر شک کرنے کی گنجائش نہیں ہے اور ہر ایک کے لیے شرف ہے- امام صاحب کو اس سے ہٹ کر کوئی روایت لانی چاہیے تھی-

آخری روایت میں عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی جائیداد جو ایک وادی میں تھی اس کو حضرت عثمان کے ہاتھ ان کی ایک ایسی جائیداد کے عوض فروخت کر دیا جو مدینہ کے قریب تھی- ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ جب بیع واجب ہو گئی تو مجھے گمان ہوا کہ میں نے ان کو ٹھگ لیا ہے- میں نے ان کو تو ثمود کے علاقہ سے قریب کر دیا اور انہوں نے مجھے مدینہ سے قریب کر دیا-

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اس روایت کو نقل کر کے راوی صاحب کیا نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں- یہ نہیں بتایا کہ اس کا اثر کیا ہے- اگر عبداللہ بن عمرؓ کا بیع کو واجب کرنے کا طریقہ کار بتانا مقصود ہے تو وہ تو اوپر بیان ہو چکا-

باب ۱۳۲۴- ما یکرہ من الخداع فی البیع-

باب بیع میں دھوکہ دینا مکروہ ہے

۱۹۸۶- حدثنا عبداللہ بن یوسف اخبرنا مالک عن عبداللہ بن دینار عن عبداللہ بن عمرؓ ان رجلا ذکر النبی ﷺ انہ یخدع فی البیوع فقال اذا بایعت فقل لا خلابۃ

ترجمہ: ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے ذکر کیا کہ میں جب بھی کوئی کاروبار کرتا ہوں دھوکا کھا جاتا ہوں تو آپ نے فرمایا کہ جب تم کوئی خرید و فروخت کرو تو کہہ دیا کرو کہ کوئی دھوکہ نہیں ہو گا-

وضاحت: اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بیع اس شخص کی طرف سے بیع شرط ہو جائے گی- چونکہ بیع

مشروط ہے اس لیے اگر کوئی دھوکا ہو گا تو چیز واپس ہو سکے گی- گویا آنحضرت ﷺ نے اسے یہ ہدایت فرمائی کہ جب بھی وہ بیع کرے قطعی نہ کرے بلکہ مشروط کرے-

باب ۱۳۲۵- ما ذکر فی الاسواق و قال عبدالرحمن بن عوف لما قدمنا المدینۃ قلت هل من سوق فیه تجارۃ قال سوق قینقاع و قال انس قال عبدالرحمن دلونی علی السوق و قال عمر الهانی الصفق بالاسواق-

باب بازاروں کے متعلق: عبدالرحمٰن بن عوف کہتے ہیں کہ جب ہم مدینہ آئے تو میں نے پوچھا کہ یہاں کوئی بازار بھی ہے جہاں کوئی کاروبار ہو سکتا ہو تو کہا گیا کہ قینقاع کا بازار ہے- اور انس کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن نے کہا کہ مجھے بازار کا رستہ بتلا دو- اور حضرت عمرؓ نے کہا کہ مجھ کو بازاروں کے کاروبار نے غافل رکھا-

اس باب میں تین تعلیقات ہیں- دو تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے متعلق ہیں اور یہ روایت پہلے گزر چکی ہے- وہ جب مدینہ آئے تو ان کے انصاری بھائی نے کہا کہ میری جائیداد ہے، دو بیاں ہیں، جو کہو گے آدھا آپ کو دوں گا تو حضرت عبدالرحمٰن نے کہا کہ دلونی علی السوق یعنی مجھ کو بازار کا راستہ بتلا دو اور مال اور بیویاں تم ہی کو مبارک ہوں- چنانچہ ان کو وہ قینقاع کے بازار کا رستہ دکھایا گیا-

حضرت عمرؓ سے متعلق روایت بھی پہلے تفصیل سے آ چکی ہے کہ جب انہیں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے یہ بتایا کہ تین مرتبہ ملاقات کی اجازت طلب کرنے کے بعد حکم ہے کہ اجازت نہ ملنے پر آدمی واپس چلا جائے تو انہوں نے کہا کہ گواہی لاؤ- جب گواہی دی گئی تو حضرت عمرؓ نے افسوس کا اظہار کیا کہ بازار کے لین دین میں پھنس کر میں غافل رہا اور اس حدیث کی سماعت سے محروم رہا- امام صاحب نے یہاں تینوں روایتوں کا حوالہ دیا ہے-

۱۹۸۷- حدثنا محمد بن الصباح حدثنا اسمعیل بن زکریا عن محمد بن سوقه عن نافع بن جبیر عن مطعم قال حدثنی عائشةؓ قالت رسول اللہ ﷺ یغزو جیش الکعبة فاذا کانوا ببیداء من الارض یخسف باولهم و آخرهم قالت قلت یا رسول اللہ ﷺ کیف یخسف باولهم و آخرهم و فیهم اسواقهم و من لیس منهم قال یخسف باولهم و آخرهم ثم یبعثون

علی نیاتھم-

ترجمہ : حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، وہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک لشکر کعبہ پر حملہ کرے گا تو جب وہ سرزمین کے کھلے میدان میں ہوں گے تو ان کے اول و آخر سب زمین میں دھنسا دیے جائیں گے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے پوچھا یا رسول اللہ یہ کیسے ہو گا کہ ان کے اول اور آخر سب دھنسا دیے جائیں گے جبکہ ان میں ان کے بازار بھی ہوں گے اور وہ لوگ بھی جو ان میں سے نہیں۔ آپ نے فرمایا اول سے لے کر اخیر تک سب دھنس جائیں گے پھر قیامت کے دن اپنی اپنی نیت کے مطابق اٹھائے جائیں گے۔

وضاحت : یہ روایت بہت مشکل ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ رسول اللہ ﷺ نے کوئی پیشین گوئی کی ہے یا کوئی رویا بیان فرمائی ہے۔ یہ شبہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ دوسری روایت میں جو حضرت عائشہؓ ہی سے ہے، وہ فرماتی ہیں ایک دن نبی ﷺ سے سوتے میں کچھ غیر معمولی باتیں صادر ہوتے دیکھنے میں آئیں۔ اس کے بعد حضور نے یہ واقعہ بیان فرمایا تو ظاہر ہے کہ اس کا واضح قرینہ تو یہی ہوا کہ آپ نے کوئی رویا بیان کی ہو۔ رویا تعبیر کی محتاج ہوتی ہے اور کسی روایت میں اس کی تعبیر نہیں ہے۔ اگر فرض کر لیجئے کہ رویا کو ظاہر ہی پر محمول کریں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا لشکر ہے جو مکہ پر حملہ آور ہوا اور پھر اس کا یہ انجام ہوا۔ صرف ایک واقعہ کا حوالہ دیا جاتا ہے اور وہ عبداللہ بن زبیرؓ کا ہے جب وہ مکہ پر قابض ہو گئے تو اموی حکومت نے ان پر حملہ کیا۔ لیکن اس لشکر کو بھی یہ افتاد پیش نہیں آئی بلکہ وہ تو اپنے مقصد میں کامیاب رہا اور اس نے عبداللہ بن زبیرؓ کو سولی بھی دے دی۔ کعبہ پر چڑھائی کا حضور کی بعثت سے پہلے کا واقعہ اصحاب فیل کا ہے لیکن اس کا بھی یہاں سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ حوالہ بعد میں پیش آنے والے کسی واقعہ کا ہے۔ اگر اس کو پیش گوئی پر محمول کیجئے تو ابھی تک اس کی تصدیق نہیں ہوئی۔ لیکن پیشین گوئیوں کے وقت کا تعین نہیں ہو سکتا۔ وہ مستقبل میں کسی وقت بھی ظاہر ہو سکتی ہیں۔

عذاب دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ رسول کے کامل اتمام حجت کے بعد اس کے نہ ماننے والوں پر عذاب آتا ہے۔ سنت الٰہی اس وقت یہ ہوتی ہے کہ رسول کو صالحین و ابرار کو ساتھ لے کر ہجرت کر جانے کا حکم ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد خاص ان لوگوں پر عذاب آتا ہے جو متکبرین اور مکذبین

ہوتے ہیں۔ دوسرا وہ عذاب ہوتا ہے جو ابتلاء کے لیے ہوتا ہے اور اس میں البتہ نیک و بد دونوں لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ اس دوسرے عذاب میں مبتلا تو ہو جائیں گے سب نیک و بد لیکن قیامت کے دن اٹھیں گے اپنی نیت کے مطابق۔ مطلب یہ کہ قیامت کے دن نیکوکار بری ہوں گے اور اس ابتلاء میں جو دکھ ان کو پہنچا ہو گا وہ ان کے لیے کچھ کفارہ بن جائے گا۔ یہ دونوں اصول قرآن کے مطابق ہیں اور روایت میں یہ پہلو قابل غور ہے۔

۱۹۸۸- حدثنا قتیبة حدثنا جریر عن الاعمش عن ابی صالح عن ابی ھریرة قال قال رسول اللهﷺ صلوٰة احدکم فی جماعة تزید علی صلوته فی سوقه و بیته بضعا و عشرین درجة و ذالك بانه اذا توضأفا حسن الوضوء ثم اتی المسجد لا یرید الا الصلوٰة لا ینهزه الا الصلوة لم یخط خطوة الارفع بها درجة او حطت عنه بها خطیئة والملٰئكة تصلی علی احدکم مادام فی مصلاه الذی یصلی اللهم صل علیه اللهم ارحمه مالم یحدث فیه مالم یؤذ فیه و قال احدکم فی صلاة ما کانت الصلوٰة تحبسه-

ترجمہ : حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کسی کی نماز باجماعت اس کی اس نماز سے بیس درجہ سے کچھ زیادہ ہو گی جو اس نے بازار میں یا گھر میں پڑھی ہو گی۔ یہ اس وجہ سے کہ جب وہ اچھی طرح وضو کر کے مسجد میں آتا ہے اور صرف نماز ہی کی نیت سے آتا ہے، نماز ہی نے اس کو اٹھایا ہوتا ہے تو جو قدم وہ اٹھاتا ہے ہر قدم پر اس کا ایک درجہ بلند ہوتا ہے یا ایک گناہ مٹتا ہے اور فرشتے اس شخص پر رحمت بھیجتے ہیں جب تک کہ وہ جائے نماز پر ہو گا جہاں وہ نماز پڑھ رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اے اللہ اس پر رحم کر، اے اللہ اس پر اپنا فضل فرما۔ اس وقت تک یہ بات ہوتی رہتی ہے جب تک کہ وہ اس میں کسی حدث کا مرتکب نہ ہو یا اس میں کسی کو نہ ستائے۔ اور آپ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک نماز ہی میں رہتا ہے جب تک نماز کے لیے رکا رہے۔

وضاحت : گھر کی نماز، بازار کی نماز اور مسجد کی نماز میں بہر حال فرق درجات ہو گا۔ کیونکہ نماز کے لیے مسجد اصل جگہ ہے۔ وہاں پر سارے لوازم ساری خصوصیات سمیت جمع ہوتے ہیں۔ جبکہ بازار کاروبار کے لیے اور گھر آرام اور آسائش کے لیے ہے۔ نمازوں میں فرق درجات اس وجہ سے ہو گا کہ آدمی مسجد میں

آئے گا تو اس کا مقصد سوائے نماز کے اور کچھ نہ ہو گا- لایرید الا الصلوٰۃ اس کی شرح ہے- اور فرشتے اس کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ کسی حدث کا مرتکب نہ ہو- یعنی جب تک اس کا وضو قائم رہے- مالم یوذ فیہ اسی حدث کی تعبیر ہے یعنی حدث ان کے لیے باعث اذیت ہو گا- فرشتے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ اس پر رحم کر، اے اللہ اس پر فضل فرما- میرے نزدیک یہی فرشتوں کی شفاعت ہے- اس وجہ سے اس شخص کے لیے جو بے عمل ہے کسی کی شفاعت کا سوال بالکل خلاف عقل ہے-

۱۹۸۹- حدثنا ادم بن ابی ایاس حدثنا شعبة عن حمید الطویل عن انس بن مالک قال کان النبی ﷺ فی السوق فقال رجل یا اباالقاسم فالتفت الیه النبی ﷺ فقال انما دعوت هذا فقال النبی ﷺ سموا باسمی ولا تکنوا بکنیتی-

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بازار میں تھے تو ایک شخص نے کہا اے ابوالقاسم! نبی ﷺ سن کر متوجہ ہوئے تو اس شخص نے کہا میں نے اس شخص کو بلایا ہے (آپ کو نہیں) تو نبی ﷺ نے کہا کہ میرے نام پر نام تو رکھو لیکن میری کنیت پر کنیت نہ رکھو-

۱۹۹۰- حدثنا مالک بن اسمعیل حدثنا زهیر عن حمید عن انسؓ دعا رجل بالبقیع یا اباالقاسم فالتفت الیه النبی ﷺ فقال لم اعنک قال سموا باسمی ولا تکنوا بکنیتی-

ترجمہ: انسؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے بقیع میں آواز دی اے ابوالقاسم! آنحضرت ﷺ نے اس کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگا میں نے آپ کو نہیں پکارا تھا- آپ نے فرمایا میرے نام پر نام تو رکھو لیکن میری کنیت پر کنیت نہ رکھو-

وضاحت: اس حدیث کے بارے میں علماء کا کہنا یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی حیات مبارکہ میں یہ ہدایت تھی لیکن بعد میں منسوخ ہو گئی- یہ بات صحیح ہے- اب اگر یہ ہدایت منسوخ ہو گئی تو خواہ مخواہ اس کے درپے کیوں ہوں- عینی نے نقل کیا ہے کہ کتنے صحابہ ہیں جن کا نام اور کنیت ابوالقاسم ہے- جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا وہ تو آنحضرت ﷺ کو یا محمد کہہ کر پکار نہیں سکتے تھے- یہ ادب کے خلاف ہے- اسی لیے شروع ہی سے مسلمان یا رسول اللہ کہہ کر مخاطب کرتے تھے- اور کنیت آدمی کی تکریم کے لیے آتی ہے-

(ترتیب: سید اسحاق علی)

مین احسن اصلاحی

درس موطا امام مالکؒ

کتاب الجامع کی روایات

ما جاء فی الرویا

خواب کے بارے میں روایات

حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ إِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ الْأَنْصَارِی عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اَلرُّؤْيَا الْحَسَنَةُ مِنَ الرَّجُلِ الصَّالِحِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَ أَرْبَعِيْنَ جُزْأً مِنَ النُّبُوَّةِ

ترجمہ: انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اچھے خواب، جبکہ وہ ایک نیک آدمی نے دیکھے ہوں، نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہوتے ہیں-

وضاحت: اس روایت میں نبوت سے مراد علم نبوت ہے- جہاں تک نبوت کا تعلق ہے اس کا کوئی حصہ اب باقی نہیں رہا- لیکن علم نبوت میں سے صرف وحی منقطع ہوئی ہے- یہ علم دوسرے ذرائع مثلاً قرآن مجید اور سنت رسول اللہ کے ذریعہ سے باقی ہے- اس کا ایک ذریعہ انبیاء کے خواب بھی ہوتے ہیں- لہٰذا اس روایت کی رو سے علم نبوت کا فیضان نیک آدمی کے خواب میں بھی ظاہر ہوتا ہے-

خواب انبیاء کے علم کا ایک معروف ذریعہ ہیں، بالخصوص وہ معاملات کہ جن کو عملاً دکھانا ہو وہ انبیاء کو الفاظ کی بجائے رویا میں دکھائے جاتے ہیں تاکہ پورا نقشہ ان کے سامنے آجائے- انبیاء کے بڑے بڑے رویا میں مثلاً حضرت ابراہیمؑ کا وہ خواب ہے جو حضرت اسمٰعیلؑ کے ذبح کے متعلق تھا- اسی طرح آنحضرت ﷺ کو جنگ بدر کا سارا نقشہ پہلے ہی دکھا دیا گیا تھا- قرآن مجید میں اسراء کے واقعہ کو بھی رویا سے ہی تعبیر کیا گیا ہے- علم نبوت ایک سمندر ہے- اس میں ایک نیک آدمی کا اچھا خواب کتنا حصہ ہوتا ہے، اس کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا کہ یہ علم نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہوتا ہے- ہم اس اشارہ کو سمجھ

تو سکتے ہیں لیکن اس نسبت کی حقیقت نہیں جان سکتے۔ اس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ ہم علم غیب نہیں جانتے اور خواب کی تعبیر قطعیت کے ساتھ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ خوابوں کی تعبیر کا علم انبیاء کو خاص طور پر عطا کیا جاتا ہے۔ ہمارے لیے صرف یہ ہے کہ ہم اچھے خواب سے بشارت حاصل کر سکتے ہیں۔ قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہمارے خواب پریشان خواب بھی ہو سکتے ہیں۔

اہل علم جب خواب دیکھیں تو وہ بھی ان سے بشارت ہی حاصل کریں۔ ان پر ناز نہ کریں بلکہ خوابوں پر زیادہ اعتماد بھی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ہم علم غیب کو نہیں جانتے۔

حدثنی عن مالك عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی هریرة عن رسول اللہ ﷺ بمثل ذالك۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح فرمایا۔

وضاحت: یہ اوپر والی روایت کی تائید میں ہے۔

حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ إِسْحَاقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ عَنْ زُفَرَ بْنِ صَعْصَعَةَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ إِذَا انْصَرَفَ مِنْ صَلَاةِ الْغَدَاةِ يَقُولُ هَلْ رَأَى أَحَدٌ مِنْكُمُ اللَّيْلَةَ رُؤْيَا وَ يَقُولُ لَيْسَ يَبْقَى بَعْدِي مِنَ النُّبُوَّةِ إِلَّا الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جب صبح کی نماز سے فارغ ہوتے تو پوچھتے کہ کیا تم میں سے کسی نے خواب دیکھا ہے اور یہ بھی فرماتے کہ علم نبوت میں سے میرے بعد رویائے صالحہ کے سوا اور کوئی چیز باقی نہیں رہی۔

وضاحت: چونکہ خواب علم نبوت کا ایک ذریعہ تھا اس لیے آپؐ صحابہ سے نماز فجر کے بعد پوچھتے کہ کیا کسی نے کوئی خواب دیکھا۔ اگر کوئی شخص نیا خواب بیان کرتا تو آپ اس کی تعبیر بیان فرماتے۔ تعبیر کا علم بھی علوم نبوت میں سے ہے اس لیے آنحضرتؐ کی بیان کردہ تعبیر قابل اعتماد ہوتی۔ لیکن اب یہ معاملہ بہت مشکل ہو گیا ہے۔ تعبیر میں اختلاف ہوتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ صحابہؓ نے رویا کے ذریعے بڑے بڑے مسائل حل کیے ہیں۔ اذان کا مسئلہ رویا ہی سے حل ہوا۔ اذان کے الفاظ تو الہامی ہیں لیکن یہ

رویا کے ذریعے ہی سے صحابہ کرام نے دیکھے اور اس طرح یہ ہم تک پہنچے۔

حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ ابْنِ يَسَارٍ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَنْ يَبْقَى بَعْدِي مِنَ النُّبُوَّةِ إِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ ، فَقَالُوا وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ الرُّؤْيَاءُ الصَّالِحَةُ يَرَاهَا الرَّجُلُ الصَّالِحُ أَوْ تُرَى لَهُ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَ أَرْبَعِينَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ

ترجمہ: عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد علم نبوت میں سے مبشرات کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہے گی۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ وہ مبشرات کیا ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ وہ اچھے خواب ہیں جو ایک نیک آدمی دیکھے یا کوئی دوسرا اس نیک آدمی کے بارے میں دیکھے۔ یہ نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔

وضاحت: رویائے صالحہ جو ایک نیک آدمی اپنے متعلق دیکھے یا دوسرے آدمی کے لیے دیکھے تو اس سے وہ اپنے لیے یا دوسرے شخص کے لیے خوشخبری حاصل کر سکتا ہے۔ وہ دوسرے آدمی سے کہہ سکتا ہے کہ مبارک ہو، میں نے آپ کے متعلق یہ نیک خواب دیکھا، آپ بھی اس سے خوشی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن کسی خواب کے اعتماد پر کوئی دعوے کر دینا ایک غلط کام ہے۔ باقی رہ گیا اچھے خوابوں کا علم نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہونا تو اس سے ہم بس اس تفاوت کو سمجھ سکتے ہیں جو نبوت اور اچھے خواب کی بشارت میں ہے۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا ہمارے بس میں نہیں۔

حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ أَبِي سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ أَنَّهُ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا قَتَادَةَ بْنَ رِبْعِي يَقُولُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ مِنَ اللّٰهِ وَالْحُلْمُ مِنَ الشَّيْطَانِ فَإِذَا رَأَى أَحَدُكُمُ الشَّيْءَ يَكْرَهُهُ فَلْيَنْفُثْ عَنْ يَسَارِهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ إِذَا اسْتَيْقَظَ وَلْيَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّهَا فَإِنَّهَا لَنْ تَضُرَّهُ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ ، فَقَالَ أَبُو سَلَمَةَ إِنْ كُنْتُ لَأَرَى الرُّؤْيَا هِيَ أَثْقَلُ عَلَيَّ مِنَ الْجَبَلِ، فَلَمَّا سَمِعْتُ هٰذَا الْحَدِيثَ فَمَا كُنْتُ أُبَالِيهَا۔

ترجمہ: ابو سلمہ بن عبد الرحمن کہتے ہیں کہ میں نے قتادہؓ بن ربعی سے سنا، وہ کہتے تھے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ اچھے خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور خواب پریشان شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں۔ تو جب تم میں سے کوئی ایسا خواب دیکھے جو ناگوار محسوس ہو تو اس کو چاہیے کہ جب اس کی

آنکھ کھلے تو اس کے شر سے تین مرتبہ اللہ کی پناہ مانگ کر اپنی بائیں طرف پھونکے تو انشاء اللہ اس خواب کا کچھ نقصان نہ ہوگا۔ ابو سلمہ کہتے ہیں کہ پہلے میں کوئی خواب دیکھتا جو مجھ پر پہاڑ سے بھی بھاری ہوتا لیکن جب سے میں نے یہ حدیث سنی ہے تو میں ایسے خواب کی کچھ پروا نہیں کرتا۔

وضاحت : یہ روایت بخاری میں بھی ہے اور مسلم میں بھی۔ اللہ کی پناہ مانگنے کی بہترین دعا تو قرآن مجید کی آخری دو سورتیں ہیں لیکن نبی ﷺ سے اور ماثور کلمات بھی ہیں وہ آپ پڑھ سکتے ہیں۔ یہ دعائیں شیطان کو تیر کے طریقے سے لگتی ہیں اور وہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ابو سلمہ کا اپنا اثر یہ ہے کہ وہ اگر پہاڑ سے بھی بھاری خواب دیکھتے تو اس حدیث پر عمل کر کے بالکل بے خوف ہو جاتے تھے۔

حدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِیْهِ اَنَّهُ كَانَ یَقُوْلُ فِیْ هٰذِهِ الْاٰیَةِ: لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ. قَالَ هِیَ الرُّؤْیَا الصَّالِحَةُ یَرَاهَا الرَّجُلُ الصَّالِحُ اَوْ تُرٰی لَهُ

ترجمہ : ہشام بن عروہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اس آیت "ان کے لیے بشارت ہے اس دنیا میں اور آخرت میں" کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ رویائے صالحہ ہے جو ایک شخص دیکھے یا اس کے لیے کوئی دوسرا دیکھے۔

وضاحت : رویائے صالحہ اس آیت کے مطلب میں داخل کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس آیت کا موقع و محل بہت عظیم ہے۔ لہٰذا عروہ کا یہ قول اس آیت کی تاویل نہیں ہے بلکہ اس آیت کے عظیم مطالب میں سے ایک ذرہ قلیل یہ بھی ہے۔ سورہ یونس کی آیت نمبر ۶۴ اور ضمیر ھم کا مرجع آیت نمبر ۶۲ و آیت ۶۳ میں دیکھئے تو اس کا موقع و محل واضح ہو جاتا ہے۔

مَاجَاءَ فِی النَّرْدِ

شطرنج کے بارے میں

حدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُوْسَی بْنِ مَیْسَرَةَ عَنْ سَعِیْدِ بْنِ اَبِیْ هِنْدٍ عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنْ لَعِبَ بِالنَّرْدِ فَقَدْ عَصَی اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ

ترجمہ : حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو لوگ شطرنج کھیلتے

ہیں وہ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتے ہیں۔

وضاحت : بے کاری کے دور میں لوگ وقت ضائع کرنے کے لیے شطرنج اور تاش کھیلتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے شیطان کے راستے نکلتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ شیطان نے وقت ضائع کرنے کا اس سے زیادہ کارگر نسخہ کوئی ایجاد نہیں کیا، اور اگر کیا تو وہ کرکٹ ایجاد کیا ہے۔

انسان کے پاس وقت ایک بہت بڑی دولت ہے۔ جس نے اس کو ضائع کر دیا تو اس نے بہت کچھ ضائع کر دیا۔ سب انبیاء کی تعلیم یہی ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ وہ مومن کامیاب ہو گئے جو لغویات سے بچتے ہیں۔ لغو سے مراد ہر وہ چیز ہے جو آدمی کو اس کے مقصد حیات سے غافل کر دے۔ شطرنج، تاش اور کرکٹ سے زیادہ لغو کام اور کیا ہوگا۔

حدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ اَبِیْ عَلْقَمَةَ عَنْ اُمِّهِ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِیِّ ﷺ اَنَّهُ بَلَغَهَا اَنَّ اَهْلَ بَیْتٍ فِیْ دَارِهَا كَانُوْا سُكَّانًا فِیْهَا وَ عِنْدَ هُمْ نَرْدٌ. فَاَرْسَلَتْ اِلَیْهِمْ لَئِنْ لَمْ تُخْرِجُوْهَا لَاُخْرِجَنَّكُمْ مِنْ دَارِیْ وَاَنْكَرَتْ ذٰلِكَ عَلَیْهِمْ.

ترجمہ : حضرت عائشہؓ کے متعلق یہ روایت ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ ان کے گھر میں ایک خاندان کے جو لوگ رہ رہے ہیں ان کے پاس شطرنج ہے تو انہوں نے ان کو پیغام بھجوایا کہ اگر تم لوگ اپنے شطرنج کے شیطان کو نہ نکالو گے تو میں تم کو اپنے گھر سے نکال دوں گی اور اس کو انہوں نے بہت ناگوار جانا۔

وضاحت : حضرت عائشہؓ لغویات کے گناہ ہونے سے آگاہ تھیں۔ انہوں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ ان کے مکان میں لغویات کا کاروبار ہوتا رہے۔ چنانچہ انہوں نے اس کے مکینوں کو پیغام بھجوایا کہ یا تو وہ شطرنج کو گھر سے باہر پھینکیں یا پھر مکان خالی کر دیں۔ موجودہ کرایہ داری قانون کے تحت تو آپ کچھ نہیں کر سکتے بلکہ اس سے بڑے بڑے جرائم بھی کریں تب بھی کچھ نہیں کر سکتے اور آج کل شطرنج، تاش اور کرکٹ تو کسی طور پر جرائم میں شامل نہیں بلکہ اکثریت کا مشغلہ ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ ہمیں ان لغویات کی سنگینی کا مطلق احساس نہیں ہے۔

حدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّهُ كَانَ اِذَا وَجَدَ اَحَدًا مِنْ اَهْلِهِ یَلْعَبُ بِالنَّرْدِ ضَرَبَهُ وَ كَسَرَهَا. قَالَ یَحْیٰی وَ سَمِعْتُ مَالِكًا یَقُوْلُ: لَا خَیْرَ فِی الشِّطْرَنْجِ وَ كَرِهَهَا وَ سَمِعْتُهُ

يَكْرَهُ اللَّعِبَ بِهَا وَ بِغَيْرِهَا مِنَ الْبَاطِلِ وَ يَتْلُوْ هٰذِهِ الْآيَةَ: فَمَا ذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ.

ترجمہ: نافع رضی اللہ عنہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ ان کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے اہل و عیال میں سے کسی کو شطرنج کھیلتے دیکھتے تو اس کو مارتے اور شطرنج بھی توڑ دیتے تھے۔ یحیٰی کہتے ہیں کہ انہوں نے امام مالک کا یہ فتویٰ سنا ہے کہ شطرنج میں کوئی خیر نہیں اور مالک اس کو بہت مکروہ کہتے اور وہ خود اس سے یا اس کے سوا کسی اور چیز سے کھیلنا باطل سمجھتے تھے اور یہ آیت پڑھتے تھے کہ "حق کے بعد سوائے ضلالت کے اور کیا ہے"۔

وضاحت: آج کل شطرنج کے ساتھ ایک فلسفہ بھی لگا دیا گیا ہے کہ یہ کھیل بہت ذہانت پیدا کرتا ہے۔ ذہانت اگر وقت کو ضائع کرنے کا نام ہے تو ٹھیک ہے ورنہ حماقت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب شطرنج کی بازی ہو رہی ہو تو بڑے سے بڑے نقصان اور بڑے سے بڑے خطرے سے آدمی بے پرواہ ہو جاتا ہے اور بڑے سے بڑے خیر کے لیے بھی حوصلہ نہیں کرتا۔ اس سے بڑھ کر خطرناک کیا چیز ہو سکتی ہے۔

شطرنج کو امام مالک کا مکروہ جاننا حرمت کے قریب قریب ہے اس لیے کہ ان کا یہ انداز ہے کہ اگر تعریف کریں تو کہتے ہیں کہ "احب الی" مجھے یہ پسند ہے اور اگر خلاف ہوں تو کہتے ہیں "اکرہ ذالك" مجھے یہ ناگوار محسوس ہوتا ہے۔ ہمارے مولوی لوگوں کی طرح تکفیر و تحریم پر نہیں آتے۔ جو آیت امام صاحب نے نقل کی ہے اس سے وہ بات بھی نکلتی ہے جو امام صاحب کہنا چاہتے ہیں۔ اس کھیل کے ضلالت ہونے میں کیا شبہ ہے۔

العمل فی السلام

سلام کرنے کا طریقہ

حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: يُسَلِّمُ الرَّاكِبُ عَلَى الْمَاشِي، وَ إِذَا سَلَّمَ مِنَ الْقَوْمِ أَحَدٌ أَجْزَأَ عَنْهُمْ.

ترجمہ: زید بن اسلم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سوار کو چاہیے کہ وہ پیدل چلنے والے کو سلام کرے اور جب گروہ میں سے کسی ایک نے سلام کر دیا تو وہ سارے گروہ کی طرف سے کافی

ہو جائے گا۔

وضاحت: اس روایت کے دو جزو ہیں۔ پہلا تو یہ ہے کہ اگر آپ گھوڑے پر یا موٹر پر سوار ہوں تو آپ کو سلام میں پہل کرنی چاہیے۔ رعونت آپ پر سوار نہ ہو کہ میں پیدل چلنے والے کو پہلے سلام کیوں کروں۔ اور واقعی سلام کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ بس ہاتھ اٹھا دیا بلکہ جہاں بھی موقع ہو سلام کرے۔ اس لیے کہ جو لوگ سوار ہوتے ہیں وہ اس خبط میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ میرے جیسا اس روئے زمین پر کوئی نہیں۔ اس خناس کو نکالنے کے لیے یہ بہترین نسخہ ہے کہ آدمی دوسروں کو سلام کر دے۔ اس سے طبیعت میں تواضع اور فروتنی پیدا ہو جائے گی۔ آدمی کے استکبار کو ضرب لگتی ہے۔ اس معاملے میں شرمیلا پن بھی نہیں ہونا چاہیے۔

دوسری بات آنحضرت ﷺ نے یہ فرمائی کہ گروہ میں سے ایک کا سلام کرنا سب کے لیے کافی ہو گا اور اگر جواب دینے والوں میں سے کسی ایک نے جواب دے دیا تو وہ بھی سب کی طرف سے ہو جائے گا۔ یہ بھی بڑی عمدہ بات ہے کہ سلام کرنے کے لیے بھی ایک آدمی کو امام بنا لیا جائے۔ زندگی امام کے بغیر کبھی نہیں گزرنی چاہیے۔ اسی طرح مصافحہ بھی اگر ایک آدمی کرلے تو سب کے لیے کافی ہو گا۔

یہ روایت اگرچہ مرسل ہے لیکن معنی کے لحاظ سے ٹھیک ہے کیونکہ ایسی بات نبی ﷺ ہی فرما سکتے ہیں۔

حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ وَهْبِ بْنِ كَيْسَانَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَطَاءٍ أَنَّهُ قَالَ: كُنْتُ جَالِسًا عِنْدَ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ فَدَخَلَ عَلَيْهِ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْيَمَنِ فَقَالَ: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهُ، ثُمَّ زَادَ شَيْئًا مَعَ ذَالِكَ أَيْضًا. قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَهُوَ يَوْمَئِذٍ قَدْ ذَهَبَ بَصَرُهُ مَنْ هٰذَا؟ قَالُوْا هٰذَا الْيَمَانِيُّ الَّذِي يَغْشَاكَ فَعَرَّفُوْهُ إِيَّاهُ. قَالَ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ إِنَّ السَّلَامَ انْتَهٰى إِلَى الْبَرَكَةِ. قَالَ يَحْيٰى سُئِلَ مَالِكٌ هَلْ يُسَلَّمُ عَلَى الْمَرْأَةِ، فَقَالَ أَمَّا الْمُتَجَالَّةُ فَلَا أَكْرَهُ ذَالِكَ وَ أَمَّا الشَّابَّةُ فَلَا أُحِبُّ ذَالِكَ.

ترجمہ: محمد بن عطاء سے روایت ہے کہ میں عبداللہ بن عباسؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اہل یمن میں سے ایک آدمی آیا تو اس نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا۔ پھر اس کے ساتھ کچھ اور الفاظ بھی بڑھا دیے۔

ابن عباسؓ اس زمانہ میں نابینا ہو چکے تھے۔ انہوں نے پوچھا یہ کون ہے تو لوگوں نے کہا کہ ایک یمنی ہیں جو آپ سے ملنے کو آئے ہیں۔ ان کا تعارف کرایا گیا تو ابن عباس نے کہا کہ سلام کی آخری حد برکت تک ہے۔

یحییٰ کہتے ہیں کہ امام مالک سے پوچھا گیا کہ کیا عورت کو سلام کرنا چاہیے تو انہوں نے کہا کہ بڑی بوڑھی کو کر دیا جائے تو میں اسے مکروہ نہیں سمجھتا لیکن جوان عورت کو سلام کرنا میں پسند نہیں کرتا۔

وضاحت : حضرت ابن عباسؓ کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہہ دیا تو اس پر مزید کسی اضافہ کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ سلامتی، رحمت اور برکت کی دعا کے بعد اور کیا چاہیے۔ میرے نزدیک السلام علیکم خود ہی ایک مکمل دعا ہے۔ اللہ رب العزت اہل جنت کے لیے یہی لفظ استعمال کریں گے۔ نبی ﷺ انہی لفظوں سے مسلمانوں کو سلام کرتے تھے۔ اس دور میں اگر کسی کو خالی السلام علیکم لکھیں یا کہیں یا جواب میں صرف وعلیکم السلام کہیں تو اسے بالکل ناکافی سمجھا جاتا ہے۔

عورتوں کو سلام کرنے کے بارے میں امام مالکؒ کا فتویٰ ٹھیک ہے۔ لیکن میرے نزدیک سلام کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ عورت جواب نہ دینا چاہے گی تو نہیں دے گی یا اشارہ سے دے گی۔ بڑی بوڑھیوں کو سلام کرنے میں بالکل کچھ حرج نہیں۔ یہ تو کسی کو دعا دینا ہے۔

مَاجَاءَ فِی السَّلَامِ عَلَی الْیَهُوْدِیِّ وَ النَّصْرَانِیِّ

کسی یہودی اور نصرانی کو سلام کرنے کے بارے میں

حدثنی عن مالك عن عبدالله بن دینار عن عبدالله بن عمرؓ انه قال : قال رسول الله ﷺ ان الیهود اذا سلم علیکم احدهم فانما یقول السام علیکم ، فقل علیك. قال یحیٰ و سئل مالك عمن سلم علی الیهودی او النصرانی هل یستقیله ذالك؟ فقال لا.

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہود میں سے جب کوئی تم کو سلام کرتا ہے تو وہ کہتا ہے السام علیکم۔ تم جواب میں صرف 'علیک' کہہ دیا کرو۔

یحییٰ کہتے ہیں کہ امام مالکؒ سے فتویٰ پوچھا گیا کہ جو شخص یہودی یا نصرانی کو سلام کہے تو کیا اس کو ایسا کہنا چاہیے۔ تو انہوں نے کہا کہ نہیں۔

وضاحت : مدینہ کے شریر یہودیوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ جب مسلمانوں کو سلام کرتے تو بظاہر وہ مسلمانوں کے طریقہ پر السلام علیکم کہتے لیکن الفاظ ادا کرنے میں سلام میں سے حرف لام نہ بولتے بلکہ السام علیکم کہتے۔ سام کا لفظ موت کے معنی میں آتا ہے۔ گویا یہود سلامتی کی دعا دینے کے بجائے سلام کو بد دعا کا کلمہ بنا دیتے۔ ایسے شریروں کے حوالہ سے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم جواب میں محض 'علیکم' کہہ دیا کرو تاکہ یہ بد دعا یہود ہی پر لوٹ جائے۔

اس روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ غیر مسلموں کے ساتھ سلام کے بارے میں کیا کلیہ ہے۔ سلام کے بہت سے پہلو ہیں۔ سلام اجازت طلب کرنے کے لیے بھی کیا جاتا ہے، سلام کسی پر محض اعتماد کے اظہار کے لیے بھی ہوتا ہے کہ ہم اپنے ہی آدمی ہیں۔ اور سلام خیر مقدم کے لیے بھی ہے۔ خیر مقدم مسلم اور غیر مسلم دونوں کا ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ اگر تم کو کوئی سلام کہے تو یہ نہ کہو کہ "لست مومنا" (تم مومن نہیں ہو) حالانکہ یہ ممکن ہے کہ آپ نہ جانتے ہوں اور وہ کافر ہی ہو۔ وہ جو کچھ بھی ہو اگر اس نے سلام کیا ہے تو اس کا جواب دینا چاہیے۔ جواب دینے سے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا جو مذہب ہے میرے نزدیک وہ مضبوط ہے یعنی سلام کا جواب دینا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ "ردوها" یعنی سلام کا جواب ضرور دو۔ اور یہ برابر سرابر ہونا ضروری ہے۔

ایک اسلامی ملک میں کچھ لوگ ذمی بھی ہوں گے اور اہل صلح یا معاہد بھی ہوں گے۔ اگر آپ کو وہ سلام کہیں تو کیا آپ منہ پھیر لیں گے۔ یہ کوئی مہذب طریقہ تو نہیں۔ سلام کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم اور آپ ایک ہیں، ایک ہی ملک کے شہری ہیں، دوست ہیں دشمن نہیں ہیں۔ باہر کے لوگوں سے جب ملیں گے تو کیا کہیں گے کہ ہم سلام نہیں کرتے؟ منہ بنائے رہتے ہیں۔ آپ خیر مقدم کے لیے انگریزی میں گڈ مارننگ کہہ دیں گے لیکن فائدہ کیا ہو گا۔ سلام تو وہ بھی ہو گا۔ سلام میں دعا کا پہلو ہے۔ عربوں میں بھی پہلے وہی تھا جو انگریزی میں ہے۔ اسلام نے آ کر یہ تبدیلی کی کہ اس میں برکت کا اضافہ کر دیا۔ لہٰذا میرے نزدیک آپ سب کو سلام کر سکتے ہیں۔ یہ مشہور تعارف ہے، اظہار اعتماد ہے اور آپ کو اطمینان دلاتا ہے کہ ہم اور آپ دوست ہیں دشمن نہیں۔

(ترتیب : سعید احمد)

خالد مسعود

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی علمی خدمت

(۲۷ فروری ۲۰۰۰ء کو قائد اعظم لائبریری لاہور میں دیا گیا امین احسن میموریل لیکچر)

حامداً و مصلیاً۔

میرے لیے یہ بات باعث افتخار ہے کہ پہلے امین احسن میموریل لیکچر کے لیے منتظمین نے میرا نام تجویز کیا، پھر موضوع کا انتخاب بھی میرے اوپر چھوڑ دیا تاکہ میں اپنے گرامی قدر استاذ کے حوالہ سے کوئی بھی موضوع اپنی صوابدید کے مطابق چن لوں اور اس پر اپنی رائے کا اظہار کروں۔ مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کی وفات کے بعد ان کی زندگی کے مختلف پہلو، ان کا اخلاق و کردار، اور بعض دینی خدمات زیر بحث آچکی ہیں لیکن کوئی ایسا مقالہ میری نظر سے نہیں گزرا جس میں ان کی علمی خدمت کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہو۔ یہ موضوع اگرچہ خاصا وسیع الاطراف ہے اور اس سے انصاف کرنے کے لیے ایک مقالہ کی نہیں بلکہ ایک مستقل کتاب لکھنے کی ضرورت ہے تاہم میں اسی موضوع پر اپنے خیالات پیش کروں گا، خواہ ان کی حیثیت محض اشارات کی ہو۔

علمی تربیت

مولانا امین احسن اصلاحی کی مادر علمی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر (ضلع اعظم گڑھ یو۔پی) ہے۔ اس ادارہ کے اولین منتظمین میں مولانا شبلی نعمانیؒ اور امام حمید الدین فراہیؒ جیسے جلیل القدر لوگ شامل ہیں۔ انہوں نے مدرسہ کو جو تخیل دیا اور جس کے مطابق نصاب درس تجویز کیا وہ امام فراہیؒ کے الفاظ میں یہ ہے:

"مدرسۃ الاصلاح کا دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط و تنزل کا اصلی سبب یہی ہے کہ وہ قرآن مجید کی تعلیم کو آہستہ آہستہ کم کرتے گئے اور وہ علوم جو قرآن مجید کے لیے آلہ اور وسیلہ ہو سکتے تھے ان کی تحصیل میں اس قدر مصروف ہو گئے کہ وہ

خود مقصود بالذات بن گئے۔ یہاں تک کہ ہوتے ہوتے قرآن مجید کے درس و تدریس کے لیے انہوں نے بالکل جگہ نہ چھوڑی اور اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ محض تلاوت و حفظِ الفاظ پر اکتفا کر لیا گیا اور ہم پر رسول خدا کی یہ شکایت منطبق ہونے لگی کہ یَا رَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (اے میرے رب، میری قوم نے اس قرآن کو پس انداز کردہ چیز بنا لیا) لیکن اللہ کی توفیق سے مدرسۃ الاصلاح نے یہ راز پا لیا اور قرآن مجید کو سرچشمہ ہدایت و ترقی تسلیم کر کے جملہ علوم کی تعلیم اس کی تعلیم کے ماتحت کر دی۔ وہ ادب، فقہ، حدیث، تاریخ و سیر، منطق و حکمت کی تعلیم دیتا ہے لیکن اس طور پر کہ جس علم کی طرف قدم بڑھے قرآن کی روشنی میں بڑھے اور جو دروازہ کھلے قرآن ہی کے اندر سے کھلے۔"

مدرسہ سے سند فراغ پانے کے بعد مولانا اصلاحیؒ کو امام فراہیؒ جیسی نابغہ شخصیت سے براہ راست فیض یاب ہونے کا خاص موقع ملا۔ استاذ نے کمال شفقت و توجہ کے ساتھ مولانا کی فکری رہنمائی کی اور ان کو علوم قرآن کا ایسا شیدائی بنا دیا کہ اس کے بعد پوری زندگی میں وہ اس جانب سے غافل نہ ہو سکے۔ کلام الٰہی ان کے دل کی بہار، ان کے سینے کا نور، ان کی مشکلات میں سہارا اور ان کے غم کا مداوا بن گیا۔ انہوں نے پڑھا تو اسی کے افہام و تفہیم کی خاطر اور لکھا تو اسی کو محور بنا کر لکھا۔ اور آج دنیا ان کو قرآن مجید کے ایک عظیم شارح و ترجمان کی حیثیت سے پہچانتی ہے۔

مولانا نے اپنے علمی کام کا آغاز اپنے استاذ امام فراہیؒ کے افکار و تحقیقات کو اہل علم میں روشناس کرانے سے کیا۔ انہوں نے ان کے عربی میں لکھے گئے تفسیری رسائل اور اصول تفسیر کے بارے میں تحقیقات کو اردو جامہ پہنایا جس سے ان بیش قیمت جواہر پاروں کو ایک وسیع علمی دائرہ میں پھیلانا ممکن ہو گیا۔ اسی دوران میں انہوں نے استاذ کے اصولوں کی روشنی میں اپنا ذاتی تحقیقی کام شروع کر دیا جس کے نتائج آہستہ آہستہ سامنے آئے۔ مولانا کا یہ کام تفسیر، حدیث، اصول فقہ، کلام اور تزکیہ نفس کے موضوعات پر محیط ہے۔

فکر فراہیؒ

قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ یہ صحیفۂ آسمانی اپنے مدعا میں بالکل واضح ہے۔ اس کا اساسی پیغام مختلف پیرایوں میں سامنے آکر کوئی ابہام نہیں چھوڑتا اور ہر طالب ہدایت اس سے ہدایت حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک صاحب فہم کے لیے، جو گہرائی میں اتر کر اس کا مطالعہ کرنا چاہے، اس میں بڑی مشکلات بھی ہیں۔ عربی زبان اور اسلوب کلام کی مشکلات کے علاوہ لوگ آیات کو سیاق و سباق (CONTEXT) میں رکھ کر سمجھنا مشکل ہی نہیں پاتے بلکہ یہ رائے رکھتے ہیں کہ ہر آیت اپنی جگہ پر الگ مضمون کی حامل ہوتی ہے اور جہاں تک کلام کا تعلق ہے تو یہ غیر مربوط ہے۔ اس تصور کے تحت ہر شخص آیات کی ترجمانی اپنے رجحان طبع اور ذہنی اپج کے مطابق کر سکتا ہے۔ چنانچہ عرصہ دراز سے قرآن مجید پر غور کرنے کا یہ طریقہ رائج ہے کہ سارا اعتماد تفسیر کی ان قدیم کتابوں پر کیا جاتا ہے جن میں ائمہ تفسیر کے اقوال نقل کیے گئے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک قول یا چند اقوال کو بلاوجہ ترجیح دے لیا جاتا ہے یا تفسیر کی رائج کتابوں کی ہر بات مجرد اس دلیل کی بنا پر حق سمجھ لی جاتی ہے کہ وہ ان کتابوں میں نقل ہے۔ یہ طریقہ ان لوگوں کے لیے موزوں نہیں ہے جو اقوال کو دلائل کی کسوٹی پر بھی پرکھنا چاہتے ہیں۔ اس طریقہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ امت مسلمہ نے ہر ہر آیت کی اتنی تفسیریں بیان کر دیں کہ اصل مفہوم غائب ہو گیا اور امت خود بھی تفرقہ کا شکار ہو گئی۔ امام فراہیؒ نے اس صورت حال پر طویل عرصہ تک غور و فکر کیا اور اس نتیجہ تک پہنچے کہ وحدت امت کے لیے ضروری ہے کہ قرآن فہمی میں فکری انتشار کی راہ مسدود کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے تفسیر کے لیے ایسے اصول وضع کیے جو آیات کی ایک ہی تاویل تک پہنچانے میں مدد دیں۔ انہوں نے اس حقیقت کو بھی پالیا کہ قرآن مجید کی ہر سورہ اول تا آخر مربوط اور ایک مکمل وحدت ہوتی ہے۔ اس کا ایک مخصوص موضوع ہوتا ہے جس کو انہوں نے عمود سے تعبیر کیا۔ انہوں نے بتایا کہ جب سورہ کا عمود متعین ہو جائے تو اس کے تمام مباحث کو اس عمود کے ساتھ وابستہ کرنا ممکن ہو جاتا ہے اور ہر آیت اپنے سیاق و سباق میں جو مفہوم دیتی ہے وہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اس میں کئی معنوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ لہٰذا قرآن کو سمجھنے کے لیے آیات کے نظم و ربط کو سمجھنا ازبس ضروری ہوتا ہے۔ امام فراہیؒ کے نزدیک قرآن مجید کلام اللہ

ہونے کے باعث دوسری ہر چیز پر حاکم ہے لہٰذا ہر وہ علم جس کا تعلق قرآن کے موضوع سے ہے اسی سے مستنبط ہونا چاہیے اور اس کی بنیادیں قرآن کی دی ہوئی ہدایت پر استوار ہونی چاہئیں۔

استاذ کے اس فکر کو مولانا اصلاحیؒ نے جس طرح اپنایا اور وسیع دائروں میں اس کا اطلاق کیا وہ انہی کا حصہ ہے۔ ان کے علمی کام کا مرکز و محور قرآن مجید ہے اور ان کا تمام علمی کام اسی اصل سے پھوٹا ہے۔ اس میں سر فہرست ان کی عظیم تفسیر تدبر قرآن ہے۔

تفسیر تدبر قرآن

تفسیر تدبر قرآن ایک منفرد انداز میں تصنیف کی گئی ہے۔ مولانا اصلاحی ہر سورہ کی تفسیر سے پہلے اس کا مرکزی مضمون یا عمود بیان کرتے اور پہلی اور پچھلی سورتوں کے ساتھ اس کے معنوی ربط پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد وہ پوری سورہ کا تجزیہ کرکے آیات کے ایسے مجموعوں کی نشاندہی کرتے ہیں جو ایک مضمون پر مشتمل ہوتی ہیں۔ پھر وہ ہر مجموعہ کو لے کر اس کی تفسیر کرتے ہیں۔ اس میں وہ ہر آیت کے مشکل الفاظ اور جملوں کی ساخت نیز اسالیب زبان کی شرح کرتے ہیں، پھر ہر آیت کا اندرونی نظم کھولتے اور آیات کے مجموعہ میں اس کا مفہوم واضح کرتے ہیں۔ اس طرح ہر آیت کا مفہوم اپنے سیاق و سباق میں متعین ہو جاتا اور پوری سورہ ایک وحدت کی صورت میں سامنے آجاتی ہے۔ یہ طرز بیان بالکل نیا اور نہایت دل نشین ہے۔ تدبر قرآن متعدد خصوصیات کی حامل ہے جن میں سے اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) مولانا اصلاحی نے شعوری کوشش کر کے اپنی تفسیر کو قرآن کے اپنے پیغام کو واضح کرنے تک محدود رکھا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ قرآن کا اصل مفہوم سامنے آئے اور الفاظ کا جتنا تقاضا ہے اسی کے بقدر وضاحت کی جائے۔ اسی لیے نہ تو انہوں نے کلامی و فقہی مسالک اور ان کی موشگافیوں کو تفسیر میں جگہ دی ہے اور نہ کسی رائج الوقت نظریہ کی حمایت و مخالفت کے لیے قرآن کو ذریعہ بنایا ہے۔ حتیٰ کہ شان نزول کی روایات میں سے اگر کسی روایت کا تذکرہ ضروری سمجھا ہے تو اس کو سرسری طور پر بیان کر دیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ ایک طالب علم قرآن کے الفاظ کے ساتھ مربوط رہتا ہے اور کوئی چیز اس کی توجہ اصل مضمون سے ہٹانے کا باعث نہیں بنتی۔

(ب) تفسیر کی ایک خوبی اس کی تفہیم کا انداز ہے۔ الفاظ سے لے کر جملوں، آیات، آیات کے مجموعوں اور پوری سورہ کی تفہیم یہ اس طرح کرتی ہے جیسے کوئی گائیڈ کسی نووارد کی انگلی پکڑ کر اسے منزل تک پہنچادے۔ جہاں کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اس کا جواب ملتا ہے، جہاں اعتراض پیدا ہوتا ہے اس کی تشفی بخش وضاحت موجود ہوتی ہے، کوئی نحوی مشکل ہو تو اس کا حل فراہم کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے ہر ہر پہلو سے آیات پر غور کیا ہے اور اس دوران میں جو مشکلات خود انہیں پیش آئی ہیں اپنے قاری کے لیے پہلے ہی سے ان کا حل پیش کر دیا ہے۔

(ج) دوسری تفاسیر کے مصنفین دوران تفسیر اپنے نکات، تحقیقات اور ضمنی مسائل اتنی تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ اصل سلسلہ کلام سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔ مولانا کے استاذ بھی تفسیری نکات اور جزوی مسائل پر بکثرت طویل فصلیں لکھتے ہیں۔ تدبر قرآن میں ایسا نہیں ہے۔ گنتی کے چند موضوعات کے سوا انہوں نے کوئی فصل تفسیر کے بیچ میں داخل نہیں کی اور ان چند موضوعات کو بھی وہ ایسے مقام پر لائے ہیں جہاں سلسلہ کلام میں خلل واقع نہیں ہوتا۔

(د) مولانا اصلاحی نے تکلف کر کے کوئی مفہوم تراشنے سے گریز کیا ہے۔ وہ سادہ تفسیر اختیار کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک قرآن کے اولین مخاطب سادگی پسند تھے اور انہی کے مزاج کے مطابق قرآن نازل ہوا۔ چنانچہ مولانا اصلاحی تفسیر کے لیے جدید سائنسی تحقیقات کو خاطر میں نہیں لاتے۔ مثال کے طور پر سورہ انبیاء کی آیت ۳۰ میں آسمان وزمین کے لیے رتق اور فتق (بند ہونا اور کھلنا) کے الفاظ آئے ہیں۔ جدید مفسرین اس سے BIG BANG THEORY کو مراد لیتے ہیں جس کے مطابق پہلے آسمان وزمین یکجا تھے۔ پھر ایک دھماکا ہوا تو ان کے پرزے چاروں طرف پھیلنے لگے اور وہ ابھی تک اپنے مرکز سے ہٹتے ہی چلے جارہے ہیں۔ مولانا کے نزدیک آسمان کے بند ہونے اور کھلنے سے مراد امساک باراں اور پھر بارش کا برسنا ہے۔ اسی طرح زمین کا رتق و فتق اس کے مساموں کا بند ہونا اور بارش ہونے پر کھلنا اور نباتات اگانا ہے۔

مولانا فراہیؒ کی تفسیر سورہ ذاریات میں نطق سے قیامت کے استدلال کی بحث کو مولانا اصلاحی نے تکلف قرار دیا ہے اور اس کے لیے کلمہ "کن" کی تعبیر کو زیادہ مناسب قرار دیا ہے۔ سورہ

مرسلات میں امام فراہیؒ نے جہنیوں کے لیے دھوئیں کے سہ شاخہ ہونے کی توجیہ یہ کی ہے کہ کفار کی تین نمایاں خصلتوں کے لحاظ سے دھواں سہ شاخہ ہو کر ان پر پھیلے گا۔ مولانا اصلاحی کہتے ہیں کہ بیک وقت کسی کافر میں تینوں خصلتوں کا پایا جانا ضروری نہیں۔ اس لیے بہتر تاویل یہ ہو سکتی ہے کہ ایک سمت سے جہنیوں کو ہانک کر لایا جارہا ہو گا باقی تینوں سمتوں میں دھوئیں کے بادل چھائے ہوں گے۔

(ہ) تفسیر میں الفاظ کے معانی کی تحقیق، نحوی ترکیب اور اسالیب کلام پر اہم بحثیں ملتی ہیں۔ یہ چیز ان لوگوں کے اندر تو بے چینی پیدا کرتی ہے جو خالص علمی مباحث میں دلچسپی نہیں رکھتے لیکن مولانا کی تفسیر صرف عربی سے نابلد لوگوں کے لیے نہیں لکھی گئی بلکہ عربی جاننے والوں کے لیے بھی ہے۔ ان کے لیے یہ فنی مباحث نہایت قیمتی اور ان کی ضرورت کی چیز ہیں۔ قرآن فہمی کی مشکلات کو دور کرنے میں ان مباحث کا بڑا حصہ ہے۔

(و) تدبر قرآن کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس میں قرآن کے استدلال کو اس طرح کھولا گیا ہے کہ ہر عقیدہ اور دعوئ کے فطری و عقلی دلائل کھل کر سامنے آگئے ہیں۔ قرآن کا مطالعہ کرنے والا ایک عام شخص چاند، سورج، ہوا بارش، سمندر، کشتی وغیرہ کا ذکر آنے پر سوچتا رہ جاتا ہے کہ آخر وہ کیا خاص بات ہے کہ قرآن میں ان کا تذکرہ بار بار ہوا ہے۔ تدبر قرآن میں ایسی تمام اشیاء کے اندر شہادت کا پہلو اتنی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ اس سے آدمی اطمینان قلب کی دولت پاتا ہے۔

(ز) مولانا اصلاحیؒ نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی سوچ کے مطابق اور اپنی آزاد رائے کی روشنی میں لکھا ہے۔ محض نقل انہیں کہیں گوارا نہیں ہوئی۔ وہ جس رائے کو دلیل کی روشنی میں اختیار کر لیتے ہیں اس کو اپنی نہایت قیمتی متاع سمجھتے ہیں۔ وہ صاف لکھتے ہیں:

> "کتاب و سنت کے سوا میں کسی چیز کو حجت نہیں سمجھتا اور غور و تدبر میرے نزدیک انسانی فضائل میں سب سے برتر اور سب سے اعلیٰ فضیلت ہے۔ میری کوشش یہ ہے کہ ایک مدت دراز سے قرآن وحدیث پر غور و تدبر کی جو راہ مسدود ہے وہ اب کھل جائے۔ اور اگر اس راہ میں مجھ سے کوئی خدمت بن آئی ہے تو مجھے اس سے ہچکچانا نہیں چاہیے۔" (دیباچہ تدبر قرآن)

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جب بعض اہم تفسیری مشکلات کو حل کیا ہے تو ان کو مدلل کر کے برملا بیان بھی کر دیا ہے اور کسی مصلحت کو آڑے نہیں آنے دیا۔ مثال کے طور پر اصحاب الاعراف کی تعیین، اسیران بدر سے فدیہ کے معاملہ، شادی شدہ زانی کی سزا اور ازواج نبیؐ کے ایلاء و تخییر کے واقعات میں مولانا کا موقف نہایت دوٹوک طریقہ سے مدلل ہو کر سامنے آیا ہے، اگرچہ ان معاملات میں مفسرین کی رائیں بے حد الجھی ہوئی ہیں۔

مولانا اصلاحیؒ کی یہ آزادئ فکر ان سورتوں کی تفسیر میں بھی سامنے آئی ہے جو ان کے استاذ گرامی کی تفسیر نظام القرآن میں شامل ہیں۔ استاذ کے طریقہ کے برعکس انھوں نے سورتوں کی تفسیر اپنے پیرایہ بیان میں کی ہے، ضمنی مباحث کو یک قلم ختم کر دیا ہے۔ سورتوں کے عمود انھوں نے اپنے متعین کیے ہیں جس کے باعث تفسیر میں بھی فرق واقع ہوا ہے۔ مثال کے طور پر مولانا فراہی کے نزدیک سورہ تحریم کا عمود 'محاسبہ میں سخت گیری' ہے۔ مولانا اصلاحی اس کو 'محبت کے اندر اللہ کی حدود کی حفاظت' سے تعبیر کرتے ہیں۔ سورہ مرسلات کا عمود استاذ کی تحقیق میں 'قیامت، خشیت اور احسان' ہے جب کہ تدبر قرآن میں حشر و نشر اور جزا و سزا کے ایک شدنی امر ہونے کو عمود قرار دیا گیا ہے۔

(ح) مولانا اصلاحیؒ کی سوچ نہایت عاقلانہ اور بے حد متوازن ہے۔ اس میں نہ تو ان لوگوں کی بے اعتدالی پائی جاتی ہے جو صدیوں پرانے معیار فہم و تحقیق کو حرز جان بنائے ہوئے ہیں اور دین میں عقل کا کوئی مقام تسلیم کرنے کو تیار نہیں اور نہ دور حاضر کے ان لوگوں کی آزاد خیالی اور بے راہ روی ہے جو اپنے ملی ورثہ علمی کے بارے میں احساس کمتری میں مبتلا ہیں اور ہر مسئلہ میں ان کے نزدیک رائے وہی صائب ہے جو اہل مغرب نے پیش کی ہے۔ گویا مولانا کے فکر میں وہ قدامت ہے جو عقل و دانش سے عاری نہیں اور وہ جدت ہے جس میں بے لگام قسم کی آزادروی نہیں۔

ترجمہ قرآن

جہاں تک ترجمہ قرآن کا تعلق ہے اس کا مروج طریقہ یہ ہے کہ پہلے سے موجود چند ترجمے سامنے رکھ کر اپنے ذوق کے مطابق ان کی نوک پلک درست کر کے ایک نیا ترجمہ تیار کر لیا جاتا ہے۔ تدبر قرآن میں جو ترجمہ کیا گیا ہے وہ اس انداز کا نہیں ہے بلکہ غور و فکر اور تدبر کے بعد آیات کا ربط اور سیاق

و سباق جو مضمون پیدا کرتا ہے اس کو ترجمہ میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس میں الفاظ اور جملوں کی ساخت کا لحاظ تو ہے ہی، عربی زبان کے اسالیب کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ مثلاً عربی زبان میں فصاحت و بلاغت کی مناسبت سے جملوں میں بعض الفاظ حذف کر دیے جاتے ہیں جبکہ اردو میں یہ اسلوب ناپید ہے۔ مولانا اصلاحیؒ مراد و معانی کو ادا کرتے ہوئے حذف کو کھول دیتے ہیں اور اس وضاحت کو قوسین (BRACKETS) میں لانا بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ ترجمہ میں مولانا اپنے استاذ کی اس ہدایت پر عمل کرتے ہیں کہ طرز ادا، شان کلام اور اظہار جذبات کلام کی جان ہوتے ہیں۔ ترجمہ کرتے ہوئے ان کو بدلنا عبارت کو مسخ کرنا ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ کلام الٰہی کا ترجمہ روز مرہ کی زبان سے الگ ہونا چاہیے۔ قدامت طرز متانت کے موافق ہوتی ہے اس لیے اس کی پیروی ہونی چاہیے۔ مولانا اصلاحی نے آخری پاروں کی سورتوں کی مختصر آیات کا ترجمہ انھی کی طرح مختصر اور معنی آفرین کیا ہے جبکہ طویل آیات کا ترجمہ بیانیہ انداز میں کیا ہے۔ چونکہ یہ ترجمہ سیاق و سباق کو ملحوظ رکھ کر کیا گیا ہے اس لیے یہ قرآن مجید کا بالکل نیا (ORIGINAL) ترجمہ کہلا سکتا ہے۔

مولانا فراہیؒ کی فراہم کردہ بنیادوں پر مولانا اصلاحیؒ نے تدبر قرآن کی صورت میں جو عظیم عمارت تعمیر کی ہے اس کی تکمیل پر وہ اپنے استاذ کے لیے شکر و سپاس اور اپنی ذات کے لیے عجز و انکسار کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اگرچہ میں اپنے طرز فکر کو حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کے فکر کے ساتھ ملانا بے ادبی خیال کرتا ہوں لیکن چونکہ واقعہ یہی ہے کہ میں نے عمر بھر استاذ ہی کے ثمر میں اپنا ثمر ملانے کی کوشش کی ہے اور میر افکر ان کے فکر کے قدرتی نتیجہ ہی کے طور پر ظہور میں آیا ہے اس وجہ سے یہ جوڑ ملانے کی جسارت بھی کر رہا ہوں۔ اگر یہ بے ادبی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمائے۔" (دیباچہ تدبر قرآن)

نظام قرآن کی نئی جہات

امام فراہیؒ نے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، ہر سورہ کے ایک وحدت ہونے اور اس کا ایک خاص عمود ہونے کا تصور پیش کر کے قرآن مجید کو ایک مربوط و منظم کتاب ثابت کیا۔ مولانا اصلاحیؒ نے مزید

غور و فکر کے بعد اس تصور کو بڑی ترقی دی ہے۔ ان کے ہاں قرآن کے نظام کی جو نئی جہات ملتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں :

(ا) قرآن کی ہر سورہ اپنا ایک جوڑا اور مثنیٰ بھی رکھتی ہے اور ان دونوں میں اسی طرح کی مناسبت ہوتی ہے جس طرح کی مناسبت زوجین میں ہوتی ہے۔ یعنی ایک میں جو خلا ہوتا ہے دوسری اس خلا کو بھرتی ہے۔ ایک میں جو پہلو مخفی ہوتا ہے دوسری اس کو اجاگر کرتی ہے۔ اس طرح کی مثنیٰ سورتوں کا عمود اور نفس مضمون ایک ہی ہوتا ہے لیکن کبھی ایک سورہ دوسری سورہ کے اجمال کی تفصیل کرتی ہے، کبھی ایک سورہ میں عام اصول بیان ہوتا ہے اور دوسری اس اصول کی تشریح کرتی ہے، کبھی دو سورتوں میں ایک ہی مضمون کو ثابت کرنے کے لیے مختلف قسم کے شواہد استعمال کیے جاتے ہیں۔ کبھی دو سورتیں کسی معاملہ کے مثبت اور منفی پہلوؤں کے بیان کے لیے خاص ہوتی ہیں۔ کبھی ایک میں کسی معاملہ کے مقدمات اور دوسری میں ان سے نکلنے والے نتائج بیان کیے جاتے ہیں۔

(ب) بعض سورتیں ایسی بھی ہیں جن کی حیثیت ضمنی سورہ کی ہے یعنی وہ کسی سورہ کے مستقل مثنیٰ کی حیثیت نہیں رکھتی ہیں بلکہ اپنی ماسبق سورہ کے کسی ایک اہم پہلو کی وضاحت کے طور پر نازل ہوئی ہیں۔

(ج) قرآن مجید میں سورتوں کے سات ایسے مجموعے یا گروپ موجود ہیں جن کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر مجموعہ ایک یا ایک سے زیادہ مکی سورتوں سے شروع ہو کر ایک یا ایک سے زیادہ مدنی سورتوں پر ختم ہوتا ہے۔ جس طرح ہر سورہ کا ایک خاص مرکزی مضمون ہے جس سے تمام اجزائے کلام وابستہ ہوتے ہیں اسی طرح ہر گروپ کا بھی ایک جامع عمود ہے اور اس گروپ کی تمام سورتیں اس جامع عمود کے کسی خاص پہلو کی حامل ہوتی ہیں۔ مطالب اگرچہ ہر گروپ میں مشترک سے ہیں لیکن اس اشتراک کے ساتھ جامع عمود کی چھاپ ہر گروپ پر نمایاں ہے۔ ہر گروپ کی مدنی سورتیں اپنے گروپ کے عمومی مزاج سے بالکل ہم آہنگ و ہم رنگ ہیں۔ ان کو اپنے گروپ کی مکی سورتوں سے وہی مناسبت ہے جو مناسبت کسی درخت کی جڑ اور اس کی شاخوں میں ہوتی ہے۔

(د) ہر گروپ کے اندر اسلامی دعوت کے تمام ادوار ابتدا سے لے کر انتہا تک نمایاں ہوئے ہیں البتہ نمایاں ہونے کا پہلو ہر ایک کے اندر مختلف ہے۔ نیز ایجاز اور تفصیل کے اعتبار سے انداز الگ الگ ہیں۔

(ہ) قرآن مجید کی بعض سورتوں مثلاً الرحمٰن، الشعراء اور المرسلات میں ایک ہی آیت بار بار دہرائی جاتی ہے۔ اسے اصطلاح میں ترجیع کہتے ہیں۔ یہ ترجیعات تمام قرآن میں پائی جاتی ہیں اور ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک لفظی دوسری معنوی۔ لفظی ترجیعات تو مذکورہ سورتوں میں نظر آتی ہیں لیکن معنوی ترجیعات تقریباً ہر سورہ میں ہیں۔ البتہ ان کو تلاش کرنے کے لیے مضامین سورہ کا ذہن میں محفوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے اور معرفت نظم کا بہت کچھ مدار ان ہی پر ہوتا ہے۔

(و) قرآن مجید کی قسموں کے متعلق یہ بات طے ہے کہ یہ آگے آنے والے دعویٰ پر دلیل اور شہادت کے طور پر آتی ہیں۔ جو شہادت قسموں کے اسلوب میں پیش کی گئی ہے وہی شہادت سادہ اسلوب میں طویل سورتوں میں بھی آ گئی ہے۔ لہٰذا قسموں کو حل کرنے کے لیے اس مضمون کی بیانیہ آیات سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔

اصول فہم حدیث

قرآن مجید کی تفسیر کے لیے مولانا اصلاحیؒ کے سامنے امام فراہیؒ کے مجوزہ طریق کار کا ایک نقشہ اور کچھ نمونہ موجود تھا لیکن حدیث کی تحقیق و شرح کے لیے ان کے سامنے ایسی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ وہ حدیث میں ایک جلیل القدر محدث مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ (شارح ترمذی و مصنف تحفۃ الاحوذی) کے شاگرد تھے اور ان کی سند حدیث معاصر علماء میں بہت عالی تھی۔ لیکن حدیث کی تحقیق کے بارے میں ان کے استاذ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ حدیث میں اصل اعتماد سند پر ہوتا ہے۔ اگر سند قابل اعتماد ہو تو حدیث کے مضمون پر بحث لاحاصل ہے۔ مولانا اصلاحیؒ جیسے عقلی آدمی کے لیے اس نقطہ نظر سے اتفاق کرنا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا انھوں نے فہم حدیث کے لیے مفید اصولوں کی طرف رہنمائی کی ہے۔ وہ سند کو حدیث کے پرکھنے کا محض ایک ذریعہ قرار دیتے اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ متن حدیث کی نسبت چونکہ رسول اللہ ﷺ کی طرف ہوتی ہے اس لیے اس کو ہر اعتبار سے جانچ کر اس کی صحت کا فیصلہ کرنا لازم ہے۔ اس کے لیے وہ قرآن کی کسوٹی پر اعتماد کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں :

> "اس وقت حدیث کی تعلیم ہر مکتب فکر کے علماء اپنے اپنے تقیدات کے تحت دے رہے ہیں۔ کلام و عقائد اور فقہیات میں جس گروہ کا جو مسلک ہے وہ کوشش

کرتا ہے کہ قرآن وحدیث دونوں سے وہ اپنی تائید حاصل کرے اگرچہ اس کے لیے کتنا ہی ظلم کرنا پڑے۔ حالانکہ صحیح علمی طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی طرح پورے ذخیرۂ حدیث پر بھی براہ راست ان کے الفاظ، ان کے موقع و محل، ان کے سیاق وسباق، ان کے نظائر و شواہد اور قرآن کے ساتھ ان کی موافقت یا عدم موافقت کے پہلو سے غور کیا جائے اور بغیر کسی گروہی تعصب کے وہ حدیثیں اختیار کی جائیں جو مذکورہ کسوٹی پر پوری اترتی ہوں، اگرچہ وہ ہماری خواہشوں کے خلاف ہوں۔ ہمیں اتباع بہر حال رسول اللہ ﷺ کی کرنی ہے نہ کہ اپنی خواہشوں کی یا کسی خاص فقہ وکلام کی"۔ (تعارف ادارہ تدبر قرآن وحدیث)

متن حدیث کو پرکھنے کے لیے مولانا نے جو طریق کار تجویز کیا ہے اس کے اہم نکات حسب ذیل ہیں :۔

(ا) حق و باطل میں امتیاز اور دین و شریعت کی ہر چیز کی جانچ کے لیے کسوٹی قرآن مجید ہے۔ لہذا متن حدیث میں تردد ہونے کی صورت میں روایت قرآن مجید ہی کی ترازو میں تولی جائے گی۔ اس کسوٹی پر پرکھے بغیر قبول کی ہوئی روایت میں یہ امکان موجود ہوتا ہے کہ آدمی اس چیز کو دین بنالے جو دین نہیں ہے۔

(ب) جس طرح قرآن کی تمام دعوت عقل و فطرت پر مبنی اور اپنے دعاوی پر شہادت انہی سے پیش کرتی ہے اسی طرح صحیح حدیث کی کوئی بات عقل و فطرت کے منافی نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی روایت اس کے منافی نظر آئے تو اس پر اچھی طرح غور کرنا ہوگا، یہاں تک کہ اپنی عقل کی کوتاہی واضح ہو جائے یا روایت کا ضعف سمجھ میں آجائے۔

(ج) قرآن کی طرح حدیث کا بھی اپنا ایک مجموعی نظام ہے۔ ہر حدیث اس نظام کا ایک جزو مانی جائے گی۔ اس نظام سے ہٹ کر حدیث کو صحیح طور پر سمجھا جا سکتا نہ ٹھیک طور پر اس کی تاویل و توجیہ ہو سکتی ہے۔ اہل تصوف کے ہاں جو روایات رائج ہیں وہ بیشتر احادیث کے مجموعی نظام سے متعارض اور بے جوڑ ہیں۔

(د) حدیث کی اصل زبان ٹکسالی عربی ہے۔ لہذا ہر باب میں ان احادیث کو مقدم رکھا جائے گا جن کی زبان عہد نبوت و عہد صحابہ کی زبان سے ہم آہنگ ہو۔

(ہ) راوی حضرات اپنے ذوق کے مطابق واقعہ کے کسی حصہ کی روایت کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں بعض لازمی اور ضروری حصے چھوٹ جاتے ہیں۔ جیسا کہ خطبہ حجۃ الوداع کی روایات میں ہوا۔ ایک ہی راوی کی مختلف اوقات کی روایتوں میں تکمیل، تقلیل، اطناب اور ایجاز ہوتا رہتا ہے۔ لہذا کسی ناتمام روایت کی تاویل اس قسم کی دوسری روایات کے ساتھ ملا کر کرنی ہوگی۔ اس طرح جو مضمون متعین ہوگا وہ اصل ہوگا۔

(و) متن میں کلام کے عموم و خصوص، موقع و محل اور خطاب کا فہم حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس سے صرف نظر کر کے بعض روایات مثلاً امرت ان اقاتل الناس اور الائمۃ من قریش کی توجیہ اس قدر غلط ہو گئی کہ اسلام کو مطعون کرنے کی راہ کھل گئی۔

مولانا نے اپنی حیات میں تعلیم دین کے لیے دو حلقے قائم کیے تو حلقہ تدبر قرآن میں انہوں نے اپنے اصولوں پر صحیح مسلم کا درس دیا جو ان کے نزدیک حدیث کا اصل مجموعہ اور سب سے زیادہ سائنٹفک ترتیب کا حامل ہے۔ ادارہ تدبر قرآن وحدیث میں انہوں نے موطا امام مالک کا درس دیا۔ جو نبی ﷺ سے قریب العہد مرتب ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ صحیح بخاری کا درس دیا جو ان کے نزدیک اصلاً کتاب حدیث نہیں بلکہ امام بخاری کے فقہی وکلامی مذہب کی عکاس کتاب ہے۔ اس لیے اس کی تدوین فقہی و کلامی طرز پر ہوئی ہے۔ مولانا کے موطا اور صحیح بخاری کے دروس باقاعدگی سے رسالہ تدبر میں شائع ہو رہے ہیں، ان کو کتابی صورت میں لانے کے کام کا آغاز ہو چکا ہے۔

حکمت قرآن

مولانا کی رائے میں قرآن پر تدبر کے نتیجہ میں آدمی کو حکمت حاصل ہونی چاہیے جس کو قرآن مجید نے خیر کثیر قرار دیا ہے۔ مولانا نے اس حکمت کے جواہر ریزے اپنی تفسیر میں جگہ جگہ بکھیر دیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کی تفسیر سے بہت سے دینی موضوعات پر قرآن کی حکمت بہ آسانی جمع کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی مستقل تصانیف میں ان کو یکجا بھی کر دیا ہے۔ حقیقت شرک و

توحید، حقیقت نماز، حقیقت تقویٰ، دعوت دین اور اس کا طریق کار وہ کتابیں ہیں جن میں اس حکمت کے مختلف پہلو یکجا دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ کتابیں قرآن فہمی میں بھی ممد و معاون اور اس کی تربیت دیتی ہیں۔ حقیقت توحید تو گویا قرآنی استدلال کی اساسات کو واضح کرنے والی ایک اہم دستاویز بن گئی ہے۔ اس بارے میں مولانا کی تحقیق یہ ہے کہ "قرآن کے دلائل یا تو مخاطب کے اقرار پر مبنی ہوتے ہیں یا ایسے مستقل اصولوں پر قائم ہوتے ہیں جو مخاطب کے اقرار و انکار سے بالکل بالاتر ہوتے ہیں۔ پھر اس دوسری قسم کی دو قسمیں ہیں۔ یا تو ان دلائل کا ماخذ خود انسان کے نفس کے اندر ہے یا خارج میں۔ پہلی قسم کو ہم دلائل انفس سے تعبیر کریں گے اور دوسری کو دلائل آفاق سے۔ یہ سب ملا کر قرآنی استدلال کی تین قسمیں ہوئیں۔

ا۔ وہ استدلال جو مخاطب کے اقرار و اعتراف پر مبنی ہے۔ اس کے کئی پہلو ہیں۔ مثلاً جو قومیں کسی الٰہ کو مانتی ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ ان تمام صفتوں اور باتوں کو مانیں جن پر یہ لفظ مشتمل ہے یا جو قومیں اللہ کی بنیادی صفتوں کو مانتی ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ ان صفتوں کو بھی مانیں جو ان صفتوں کے لوازم میں سے ہیں۔ نیز ان صفات سے ان کی تنزیہہ کریں جو ان صفات کے منافی ہیں۔ علیٰ ھذا القیاس ان صفتوں کو تسلیم کرنے سے آدمی پر جو ذمہ داریاں اور حقوق واجب ہوتے ہیں ان کا بھی اقرار کریں۔ نیز جو قومیں کوئی آسمانی صحیفہ رکھتی ہیں یا اپنے پیچھے کوئی تاریخ رکھتی ہیں یا اپنی سوسائٹی کے اندر نیکی اور بدی کا کوئی ضابطہ رکھتی ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ ان کی بنیادی صداقتوں سے، ان کے معروف مسلمات سے اور ان کے بدیہی منطقی نتائج سے گریز نہ کریں۔ ایسا کرنا اپنے تسلیم کردہ مقدمہ سے فرار اور خود اپنے منہ سے اپنے آپ کو جھٹلانا ہے۔

۲۔ دوسری قسم دلائل آفاق کی ہے۔ اس کے بھی مختلف پہلو ہیں۔ سب سے پہلے وہ قوانین ہیں جن کا اس کائنات میں ہر آن مشاہدہ ہو رہا ہے اور جن سے ایک خدا کی اور اس کی ان تمام صفتوں کی شہادت مل رہی ہے جو قرآن نے خدا کے لیے بیان کی ہیں۔ پھر وہ قوانین ہیں جو اس کائنات کے واقعات و حوادث اور قوموں کے عروج و زوال میں کارفرما نظر آتے ہیں۔ اور جو درحقیقت انہی صفات کے مظاہر ہیں جن سے خالق کائنات متصف ہے۔

۳۔ تیسری قسم دلائل انفس کی ہے۔ ان کا ماخذ درحقیقت خود انسان کا نفس ہے اور اس سے مراد وہ فطری وجدان و اذعان ہے جو فاطر السماوات والارض نے نفوس کے اندر ودیعت فرمایا ہے"۔

یہ تو دلائل کی بڑی قسمیں ہوئیں۔ مولانا جب مزید تفصیل میں جاتے ہیں تو دلائل آفاق میں کائنات کے حسن و جمال، مختلف اجزاء میں باہمی موافقت اور سازگاری، عظیم اشیاء کے ایک محکم نظام کے تحت مقہور و مسخر ہونے، کائنات کی محکم تدبیر، ایک ضد سے دوسری ضد کے وجود پانے، ہر نظم اجتماعی کے لیے حاکمیت کے غیر منقسم ہونے، مختلف ارادوں اور مذاقوں کے تصادم کے نتیجہ میں تناسب کے وجود کے محال ہونے، حق و باطل کی آویزش میں حق کے غالب رہنے اور مختلف اشارات (Suggestions) کو شمار کرتے ہیں۔ دلائل انفس میں ان کی نگاہ انسان کے اندر عہد فطرت کے تصور، علم و یقین کی فطری طلب، احساس برتری اور ذلت و طاعت سے نفرت، ضعف و افتقار وغیرہ پر جا ٹھہرتی ہے۔

متکلمین کا طرز استدلال یونانیوں کے فرسودہ طریق استدلال سے ماخوذ ہے جس کے اندر عقل و فطرت کے لیے کوئی اپیل نہیں ہے۔ مولانا کے طرز استدلال سے قرآن کی عقلیت آشکارا ہو جاتی ہے اور عصر حاضر نے نئی نسل کے ذہنوں میں جو زہر پھیلائے ہیں ان کا تریاق بھی اس طریقہ میں ہے۔ مولانا نے قرآنی علم کلام کو مرتب کرنے کی بنیاد فراہم کر دی ہے۔

مولانا کے نہج پر غور و فکر کرنے سے عصری عمرانی علوم کے بارے میں یہ تحقیق ممکن ہے کہ ان علوم کے کون سے حصے قرآنی فکر سے مطابقت نہیں رکھتے اور یہ کہ ان میں اسلامی نقطہ نظر کیا ہونا چاہیے۔ یہ وہی ہدف ہے جو آج Islamization of knowledge کی ضرورت کا احساس رکھنے والے مسلمانوں کے اداروں کے سامنے ہے۔ اس کی نہایت عمدہ مثال مولانا کی کتاب 'فلسفہ کے بنیادی مسائل' فراہم کرتی ہے۔ جس میں انہوں نے فلسفہ کے چھ اہم بنیادی مسائل پر مغربی حکماء کی آراء کا محاکمہ کرنے کے بعد ان کے بارے میں حکمت قرآن کو واضح کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے مسلمان علماء اور دانشوروں نے ان مسائل پر پُر مغز تحریریں چھوڑی ہیں لیکن ان کے ہاں جامع قرآنی حکمت اپنے پورے استدلال کے ساتھ سامنے نہیں آتی۔ مولانا جب فلاسفہ کے خیالات کا تجزیہ کرتے

ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر موضوع پر فلاسفہ کے رجحانات کی کمزوری اور خامی کا پورا ادراک رکھتے ہیں، پھر اس کے مقابل میں جب قرآن کا فلسفہ پیش کرتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ ان کے پاس حکمت نورانی کا ایک ایسا آئینہ موجود ہے جس میں فلسفہ قدیم و جدید کے تمام تصورات کی کم مائیگی کا عکس نظر آتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ دنیا کے غیر معمولی ذہین دماغوں نے عقل و حواس پر انحصار کر کے اور وحی کے سرچشمہ سے محروم ہو کر کیسی کیسی ٹھوکریں کھائی ہیں۔

اسلامی قانون

مولانا اصلاحی کے ذہن نے دور حاضر کے جس میدان میں جولانی دکھائی ہے وہ اسلامی ریاست کی تشکیل اور اس میں اسلامی قانون کے نفاذ کا میدان ہے۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد یہ موضوع قدرتی طور پر بے حد اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ اس کے بارے میں لوگوں کے پاس معلومات کم تھیں اور جو معلومات تھیں وہ جدید دور کی ضروریات کے مطابق نہ تھیں۔ پھر نوزائیدہ مملکت میں ایسے لوگ سرگرم تھے جو پاکستان کو ایک اسلامی مملکت کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ انھیں اسلام کے اندر جدید زمانہ کے مسائل سے نمٹنے کی صلاحیت نظر نہیں آتی تھی اور اگر صلاحیت دیکھتے بھی تھے تو سوسائٹی میں اسلامی احکام کے نفاذ کے تصور ہی سے ان کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ مولانا اصلاحی نے ایک طرف تو اسلامی ریاست کے اصول و مبادی واضح کیے جن میں خلافت اور اس کے بنیادی اصول بیان کیے۔ اس میں قوم، وطن، زبان اور تہذیب و روایات کے عمل دخل پر روشنی ڈالی۔ پھر اسلامی ریاست میں بنیادی شہری حقوق اور فرائض کو واضح کیا۔ رعایا کے مختلف طبقات کا تعین کر کے ان کے حقوق متعین کیے۔ ریاست کے لیے اطاعت کے شرائط و حدود پر روشنی ڈالی اور حکومت کے کارکنوں کے اوصاف اور ان کی ذمہ داریاں واضح کیں۔ دوسری طرف اسلامی نظام کے معترضین کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کے ایک ایک اعتراض کا نہایت مدلل اور مسکت جواب دیا۔ ان مباحث میں مولانا قرآن و سنت کے علاوہ اسلامی تاریخ سے دلائل فراہم کرتے ہیں۔ نہایت دقیق مباحث کو انھوں نے ایسی سلیس زبان میں پیش کیا ہے کہ ان کی قدرت بیان پر حیرت ہوتی ہے۔ بعض موضوعات کو انھوں نے نئی تعبیر عطا کی ہے جس میں ان کو سمجھنا سہل ہو گیا ہے۔ اس کی مثالیں مولانا کی کتاب 'اسلامی قانون کی تدوین' میں دیکھی

جا سکتی ہیں۔

فقہی موضوعات پر مولانا کی تحریریں محض اصولی نہیں ہیں بلکہ جہاں انھوں نے محسوس کیا ہے کہ پاکستان کے حالات متقاضی ہیں کہ ان میں شریعت کا حل پیش کیا جائے تو وہاں انھوں نے احکام کو پاکستان کے حالات پر منطبق بھی کیا ہے اور جدید مسائل کا مواجہہ کرتے ہوئے مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ ان کا حل بھی پیش کیا ہے۔ مثلاً پاکستان کی غیر مسلم اقلیتوں پر وہ ذمیوں کے احکام نافذ کرنے کے حق میں نہیں ہیں بلکہ ان کی رائے یہ ہے کہ یہ لوگ قیام پاکستان کی جدوجہد میں شریک رہے یا انھیں تسلی دی گئی کہ پاکستان بننے کے بعد ان کے ساتھ معاملہ دوسری رعایا سے مختلف نہیں ہو گا لہٰذا ان پر معاہد اہل ذمہ کے احکام نافذ ہوں گے۔

مسلمانوں کے درمیان فقہی اختلافات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "مسلمانوں کے درمیان جو فقہی اختلافات ہیں اگرچہ وہ بالکل سرسری اور سطحی ہیں لیکن امتداد زمانہ سے ان کی جڑیں اتنی گہری اتر چکی ہیں کہ اب ان کا اکھاڑنا آسان نہیں رہا اور ان کے اکھاڑے بغیر نہ صحیح نہج پر اسلامی قانون کی تدوین ہی ممکن ہے اور نہ اس کے موثر نفاذ ہی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان من حیث الجماعت اس اصول پر مجتمع ہوں کہ ان کے قانون کے پرکھنے کے لیے اصل کسوٹی قرآن و سنت ہیں۔ اور ان پر یہ واجب ہے کہ وہ ان کسوٹیوں کو اپنے دوسرے تمام تعصبات و تعلقات سے بالکل دستبردار ہو کر تسلیم کریں"۔ (فقہی اختلافات کا حل، ص ۸)

مولانا کے نزدیک اسلامی قانون کا مزاج بیک وقت دو متضاد خصوصیات رکھتا ہے۔ ایک پہلو سے یہ ثابت اور غیر تغیر پذیر ہے، دوسرے پہلو سے اپنے اندر کافی لچک اور وسعت رکھتا ہے جس کے باعث یہ ہر زمانے کے مسائل کو حل کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ اصول فقہ کی کتابوں میں اسلامی قانون کے مآخذ میں کتاب اللہ، سنت رسول، اجماع اور قیاس کا نام آتا ہے۔ مولانا ان کی تعبیر کتاب اللہ، سنت رسول، اجتہاد، رواج اور مصلحت سے کرتے ہیں۔ اجتہاد کے بارے میں ان کی رائے یہ

ہے کہ یہ ہر مسلمان کی ہر دور کی ضرورت ہے جس کے بغیر وہ اپنی اسلامیت پر قائم نہیں رہ سکتا۔ فرماتے ہیں :

"مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ زندگی میں جو قدم بھی اٹھائے اسلام کے حکم اور اشارہ کے مطابق اٹھائے۔ زندگی جن حالات و تغیر سے بھی گزرتی ہے ان میں کوئی مرحلہ بھی ایک مسلم کے لیے ایسا نہیں آتا جس میں وہ اسلام سے استغناء کا محتاج نہ رہتا ہو۔ اپنی اسی خصوصیت کے سبب سے ایک مسلمان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اجتہاد کے بغیر اپنی اسلامیت کو برقرار رکھ سکے"۔

(اسلامی قانون کی تدوین، ص ۶۱)

اس عام تصور کے برعکس کہ مسلمانوں نے اپنے اوپر اجتہاد کا دروازہ صدیوں سے بند کر رکھا ہے مولانا کی رائے یہ ہے کہ "اس زوال و انحطاط کے باوجود جو علم دین اور اصحاب علم دین پر طاری رہا ہے ہر مسلمان ملک کے علماء نے اپنی اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق اجتہادات کیے اور اپنے اپنے ملکوں کے عوام کی رہنمائی کی"۔ تاہم مولانا اس خیال سے متفق ہیں کہ اجتہاد کی اہلیت رکھنے والے لوگ کم پیدا ہوئے اور اجتہاد کی رفتار سست رہی۔ لیکن اس کا عذر یہ بیان کرتے ہیں کہ مغرب کے لادینی اثرات کے تحت مسلمان حکومتوں نے بھی غیر اسلامی قوانین اختیار کرنے شروع کر دیے۔ اجتماعی و سیاسی زندگی کے ہر گوشہ سے اسلامی قانون کو خارج کر دیا گیا۔ جب قانون عملی زندگی سے اتنا بے تعلق ہو جائے تو اس کے سیکھنے سکھانے کا ذوق بھی مردہ ہو جاتا ہے چہ جائیکہ اس کے اندر اجتہاد کا ولولہ پیدا ہو۔ "جاہلیت کے غلبہ و تسلط کے اس عالمگیر اندھیرے میں اجتہاد کے لیے محرک کون سا باقی رہ گیا تھا"؟

۱۹۵۵ء میں حکومت پاکستان نے عائلی مسائل و قوانین کے جائزہ اور اس سلسلہ میں تجاویز و سفارشات مرتب کرنے کے لیے ایک کمیشن قائم کیا جس نے اپنی رپورٹ جون ۱۹۵۶ء میں پیش کی۔ مولانا کے الفاظ میں یہ رپورٹ مغرب زدہ طبقہ کے خیالات و نظریات کا مرقع بن گئی اس وجہ سے انہوں نے اس پر مفصل تنقید لکھنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے بڑی دقت نظر سے اجتہاد اور اصول اجتہاد کے بارے میں اس طبقہ کے خیالات جمع کر کے ان پر بحث کی اور ان کی خامیوں اور غلطیوں کو واضح کیا۔ رپورٹ کے مرتبین کے نزدیک "اجتہاد کا مفہوم کسی قانونی مسئلہ پر آزادانہ رائے قائم کرنا ہے"۔ یہ

طبقہ جن اصولوں کی روشنی میں اجتہاد کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہیں :

۱۔ جو چیز قطعی اور غیر مشروط طور پر ایک واضح حکم کے ذریعہ سے ممنوع نہیں ہے وہ جائز ہے، اگر افراد یا قوم کی بہبود اس کا تقاضا کر رہی ہو۔

۲۔ موجودہ زمانہ کا معاشرتی اور اقتصادی نقشہ اسلام کی ابتدائی صدیوں کے مقابل میں تبدیل ہو چکا ہے۔

۳۔ بعض چیزوں کی اجازت اسلام نے اس لیے دی تھی کہ انسانی سوسائٹی ہنوز اپنے دور طفولیت میں تھی۔ یہ اجازت غلط طور پر استعمال ہو رہی ہے تو اس اجازت پر اب پابندیاں عائد ہونی چاہئیں۔

۴۔ یہ تعین کرنا ہوگا کہ اسلام کے کون سے احکام سب کے لیے ہیں اور ابد تک قائم رہنے والے ہیں اور کون سے احکام ایک خاص طرز کی سوسائٹی، ایک مخصوص دور اور ایک خاص علاقہ سے تعلق رکھنے والے ہیں۔

۵۔ استحسان کا مفہوم یہ ہے کہ عوام کے مفاد کو سامنے رکھ کر جو جی میں آئے قانون بنا ڈالا جائے۔

مولانا نے تنقید کر کے ان اصول اجتہاد کے بخیے ادھیڑے لیکن تبصرہ کو تبصرہ ہی تک محدود نہ رکھا بلکہ عائلی نظام میں ان خرابیوں کی نشان دہی بھی کی جو ان پاکیزہ اصولوں اور تعلیمات کے بالکل خلاف ہیں جن پر اسلام نے اپنے عائلی نظام کو قائم کیا تھا۔ چنانچہ مولانا نے وہ تدابیر بتائی ہیں جو ان خرابیوں کو دور کر سکتی ہیں۔ اس طرح ان کا تبصرہ اسلام کے عائلی نظام پر ایک سیر حاصل بحث بن گیا ہے۔

عائلی کمیشن کی سفارشات پر تبصرہ ہو یا خاندانی منصوبہ بندی کی مہم کی وکالت پر ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب پر گرفت، جماعت اسلامی کے دفاع میں معترضین کے افکار کا جواب ہو یا دین میں حکمت عملی اور مصلحت شناسی کے مقام کے بارے میں جماعت اسلامی کے نقطہ نظر کا محاکمہ، ہر چیز میں مولانا اصلاحی بھرپور انداز میں بحث کرتے ہیں اور عقلی و نقلی دلائل کا اتنا انبار لگا دیتے ہیں کہ حریف کے لیے کوئی راہ فرار باقی نہیں رہتی۔ وہ بنیادی طور پر ایک محقق اور سکالر ہیں اس لیے دلیل ان کا سب سے موثر ہتھیار ہے۔ البتہ تنقیدی مضامین میں مولانا بسا اوقات شوخی اور طنز و تعریض سے بھی کام لیتے ہیں جو نہایت برمحل، برجستہ اور چبھتا ہوا ہوتا ہے۔ اردو ادب کے حوالہ سے تو اس کی بڑی قدر و قیمت ہے لیکن

مولانا کا اس کے بارے میں نقطۂ نظر مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"جس طرح زندگی کا خاصہ حرارت ہے اسی طرح زندہ مسائل میں بھی ایک قسم کی حرارت پائی جاتی ہے۔ اس حرارت کے سبب سے جب ان پر تنقید کی جاتی ہے تو اس تنقید میں بھی کچھ نہ کچھ حرارت کا پیدا ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس قسم کی حرارت ان مضامین میں بھی قارئین محسوس کریں گے لیکن مجھے امید ہے کہ یہ حرارت اپنے فطری اور جائز حدود سے کہیں بھی متجاوز نظر نہیں آئے گی۔ اور اگر کہیں متجاوز نظر آئے تو سمجھنا چاہیے کہ یہ محض میری ادنیٰ کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ اس میں میری جانب سے سوء نیت کو کوئی دخل نہیں ہے۔ میں نے حتی الامکان یہ مضامین لکھتے وقت اس امر کو ملحوظ رکھا کہ تنقید میں کہیں بے جا سختی یا طنز و تعریض کا رنگ غالب نہ آنے پائے"۔

مولانا اصلاحی نے امت کے اندر فقہی اختلافات کو ہوا دینے کی شدت سے مخالفت کی ہے۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ تمام فقہیں اسلامی فقہیں ہیں اور یکساں طور پر قابل قدر ہیں۔ ان کے ائمہ امت کے عظیم رجال میں سے تھے لہٰذا ان سب کے لیے احترام واجب ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"ایک شخص کا اپنے آپ کو حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کہنا اسی طریقہ سے ہے جس طرح وہ کہہ دے کہ میں لاہوری یا دہلوی ہوں۔ یعنی اس کی نوعیت محض ایک نسبت کی ہے۔ دین کے معاملہ میں واقعہ یہ ہے کہ اس نسبت پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ آدمی حنفی کیوں ہے شافعی کیوں نہیں ہے؟ یا شافعی کیوں ہے مالکی کیوں نہیں ہے، یا مالکی کیوں ہے حنبلی کیوں نہیں ہے۔ اس لیے کہ تمام ائمہ فقہاء پوری امت کے امام ہیں۔ ان ائمہ کے متعلق کسی کا بھی یہ خیال نہیں ہے کہ ان میں سے کسی کا اصول یا طریقہ گمراہی کا اصول یا طریقہ تھا۔ ان سب کی فقہ کی بنیاد کتاب و سنت پر ہے۔ سب دین کے اصولوں کو یکساں طور پر مانتے ہیں۔ ان کے درمیان جو اختلاف ہے وہ اجتہاد کا اختلاف ہے۔ ایک مسئلہ میں اجتہاد کرتے ہوئے کسی کی رائے کچھ ہو گئی ہے اور کسی کی کچھ۔ اس لیے ان کے بارے میں کوئی

تعصب نہیں ہونا چاہیے۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ ذی علم اصحاب کو رایوں کے ماننے میں کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے تو میرے نزدیک ایسے لوگوں کا فرض یہ ہے کہ وہ ہر رائے کو اس کے دلائل کی بنیاد پر مانیں۔ انھیں یہ تحقیق کرنی چاہیے کہ ایک معاملہ میں احناف کا مذہب قوی ہے یا شوافع، مالکیہ یا حنابلہ کا، پھر قوی ترین رائے کو ترجیح دینی چاہیے۔ میں ہمیشہ یہی طریقہ اختیار کرتا ہوں"۔

(فقہی اختلافات میں صحیح طرز عمل۔ تدبر ۳ : ۶۴)

مولانا کے نزدیک صحیح اسلامی حکومت کسی متعین امام کی تقلید کے اصول پر قائم نہیں ہوتی بلکہ اس کی اساس براہ راست کتاب و سنت اور اجتہاد و شوریٰ پر ہوتی ہے۔ البتہ ہر شہری اس بات میں آزاد ہوتا ہے کہ وہ اپنی انفرادی زندگی کے دائرہ میں جس فقہی و کلامی مسلک کو ترجیح دیتا ہو اس کو اختیار کر لے لیکن اجتماعی مسائل میں اسے حکومت کے قانون اور فیصلے کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ وہ اپنے فقہی مسلک کی بنا پر ان سے آزاد نہیں ہو سکتا۔

مولانا حکومت پاکستان کے ارباب کار سے شاکی ہیں کہ انھوں نے زبان سے اسلام قائم کرنے کے دعوے کرنے اور عملاً ہر اقدام اس مقصد کے خلاف کرنے کی روش اپنا رکھی ہے۔ وہ بڑے دردمندانہ انداز میں لکھتے ہیں :

"ایک معقول آدمی کے لیے معقول رویہ تو یہ ہے کہ کفر اور اسلام میں سے جس پر اس کا دل ٹھک جائے اس کو مسلک زندگی کی حیثیت سے اختیار کر لے اور مشکلات و موانع سے بے پروا ہو کر اس پر چل پڑے۔ حق و باطل سے قطع نظر کر کے یہ یکسوئی بجائے خود ایک بڑی اہم طاقت ہے۔ اور جس راہ میں بھی کوئی قابل ذکر کامیابی ہوتی ہے وہ اس یکسوئی کی بدولت ہی حاصل ہوتی ہے۔ دنیا میں ہمیشہ کامیابی حاصل کرنے والوں نے اسی طریقہ کو اختیار کیا ہے اور اپنے اپنے مطمح نظر کے لحاظ سے اسی کے بل پر کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ لیکن ہمارے ملک کے ارباب کار نے یکسوئی کی یہ اولوالعزمانہ روش اختیار کرنے کے بجائے دورخے پن کی

بزدلانہ روش اختیار کی ہے جس کو اسلامی اصطلاح میں ہم نفاق سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ نفاق انسان کی ایک مہلک بیماری کی حیثیت سے تو ضرور متعارف ہے اور ہر دور اور ہر سوسائٹی میں ایسے افراد و اشخاص پیدا ہوتے رہے ہیں جو اس بیماری میں مبتلا ہوئے ہیں لیکن ہمیں تاریخ میں کسی ایسی قوم کا سراغ نہیں ملتا ہے جس کے لیڈروں نے متفق ہو کر نفاق کو قومی پالیسی کی حیثیت سے اختیار کیا ہو اور اس کو اپنی مشکلات کے حل کی کلید جانا ہو۔ پوری تاریخ انسانی میں اس قسم کی کوئی قوم اگر ملتی ہے تو صرف ایک قوم ملتی ہے اور وہ بد قسمتی سے ہماری قوم ہے"۔

(اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام، ص ۱۵۔۱۶)

تزکیۂ نفس

مولانا کی کتاب تزکیۂ نفس کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ مولانا نے اس کو فکری اعتبار سے اپنے دینی فکر کا لب لباب قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "برسوں کے فکر و مطالعہ سے دین و شریعت کی جو روح میری سمجھ میں آئی ہے اس کا ایک حصہ میں نے ان اوراق میں الفاظ کے جامہ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے...... میں نے اس کتاب میں ان لوگوں کی رہنمائی کرنے کی کوشش کی ہے جو اپنے نفس کی اصلاح و تربیت کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے تزکیہ نفس کے وہ اصول و مبادی ان شاء اللہ سامنے آجائیں گے جو کتاب و سنت میں بیان ہوئے ہیں اور ساتھ ہی وہ بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو جائیں گی جو غلط قسم کے تصوف کی راہ سے ہمارے اندر پھیلی ہیں۔ چونکہ اس کتاب کا موضوع وہی ہے جو تصوف کا موضوع ہے اس وجہ سے مجھے جگہ جگہ اس میں مروجہ تصوف پر تنقید بھی کرنی پڑی ہے۔ ممکن ہے یہ تنقید ان لوگوں کو کچھ ناگوار ہو جو اپنے اپنائے ہوئے کسی طریقہ پر کسی تنقید کو برداشت کرنے کے عادی نہیں ہیں لیکن ایک غیر جانبدار قاری ان شاء اللہ میری کسی تنقید کو بھی تحقیق حق اور حمایت کتاب و سنت کے جذبہ اور کوشش سے خالی نہیں پائے گا"۔ (دیباچہ تزکیہ نفس حصہ اول)

ہمارے ہاں تزکیہ نفس کا جو مفہوم ارباب تصوف کے زیر اثر قائم ہوا ہے وہ عبادات اور کچھ اوراد و وظائف تک محدود ہے۔ مولانا نے قرآن و سنت پر غور کر کے اس کو اتنی وسعت دے دی ہے کہ وہ زندگی کے ہر گوشہ پر حاوی ہو گیا ہے۔ اس میں سب سے پہلے تزکیۂ علم آتا ہے۔ پھر تزکیۂ عمل اور اس

کے بعد تزکیۂ تعلقات و معاملات۔ اس تزکیہ سے بہرہ مند ہونے کے بعد سب سے بڑا عارف وہ شخص قرار پاتا ہے جو دنیا کے جھمیلوں میں پڑ کر اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کو اس طرح ادا کرے جس طرح ادا کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا اور جس کا کامل نمونہ رسول اللہ کی حیات طیبہ میں نظر آتا ہے۔ مولانا کے الفاظ میں "کسی شخص کے صاحب تزکیہ ہونے کے لیے تنہا یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ ذاکر و شاغل اور زاہد و مرتاض ہو بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے میرے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ وہ معاشرہ کا ایک خدمت گزار فرد اور اپنی ریاست کا اسلامی مفہوم میں ایک فرض شناس شہری بھی ہو"۔

مولانا اصلاحیؒ کے پیش کردہ فکر کے اس جائزہ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ انہوں نے قرآن و سنت دونوں کی تحقیق کا ایک ایسا طریق کار وضع کر دیا ہے اور اس پر عملاً کام کر کے دکھا بھی دیا ہے کہ اگر تعصبات کو راہ نہ دی جائے تو ہر مسلمان یکساں شرح صدر اور اطمینان قلب کے ساتھ ان کے حقیقی علم سے فیض یاب ہو سکتا ہے اور فرقوں میں بٹی ہوئی امت کے اختلافات کی خلیج پاٹی جا سکتی ہے۔

مولانا کی یہ عظیم خدمت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم قرآن پر تدبر کے لیے ان کا دیا ہوا لائحہ عمل اپنائیں اور نظم قرآن کے رموز پر مزید تحقیق کریں تاکہ دور حاضر کے مستشرقین کے اس اعتراض کا مسکت جواب دیا جا سکے کہ قرآن مجید ایک بے ربط اور وحدت فکر سے عاری تصنیف ہے اور اس کی ترتیب کو الٹ پلٹ کر دوبارہ ایڈٹ کرنے کی ضرورت ہے۔ مولانا اصلاحی نے تدبر قرآن لکھ کر بنیادی کام کر دیا ہے۔ اب مزید باریکیوں میں قرآن کے نظام کو ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔

مولانا نے حکمت قرآن کو مرتب کرنے کی جو راہ کھولی ہے اس پر چل کر مزید بے شمار عنوانات پر کام کیا جا سکتا ہے۔ اس میں مولانا کی تفسیر رہنما کا کام دے گی۔ حکمت قرآن کو جس قدر مدلل کر کے پھیلایا جا سکے گا اسی قدر امت کی اصلاح متوقع ہے۔ اس حکمت کی روشنی میں عصری عمرانی علوم کا جائزہ لینا اور ان کی تدوین نو کا کام بھی ضروری ہے تاکہ قرآن کی روشنی سے یہ علوم بے بہرہ نہ رہیں اور قرآن مجید کی فطری عقلیت بے نقاب ہو۔

قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کے فرائض چار بتائے گئے ہیں۔ تلاوت آیات، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیہ نفوس۔ میں غور کرتا ہوں تو مولانا اصلاحی کا علمی کام مجھے ان چاروں پر محیط نظر آتا ہے۔ اس طرح میرے نزدیک دور حاضر میں انہوں نے رسول اللہؐ کے ایک فرض شناس امتی ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

محبوب سبحانی

قیامت کی ضرورت (۴)

خدا کے قوانین و سنن کا تقاضا

قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بڑی بڑی طاقتور اور خوشحال قومیں جو اپنی فوجی قوت اور تہذیبی و تمدنی صلاحیتوں کے اعتبار سے بہت اونچا مقام رکھتی تھیں، اس طرح تباہ ہوئیں کہ کرۂ ارض سے ان کا نام و نشان ہی مٹ گیا- ایک زمانہ میں ان کی قوت و جبروت اور سطوت سے دوسری قومیں خائف تھیں لیکن پھر ایسا وقت بھی آیا کہ عبرت کے لیے ان کی تباہی کے صرف آثار باقی رہ گئے- قرآن مجید میں ایسی جن اقوام کا ذکر موجود ہے ان میں قوم نوح، عاد، ثمود، قوم لوط، اہل مدین اور قوم فرعون سر فہرست ہیں- ان کا تذکرہ کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ جب ان قوموں کا اخلاقی زوال اس حد کو پہنچا کہ ان کا اجتماعی کردار برباد ہو گیا اور رسولوں کی تنبیہات کے باوجود یہ اپنے طغیان اور سرکشی سے باز نہ آئیں، انھوں نے رسولوں کی پیش کردہ کھلی کھلی نشانیوں تک کا تمسخر اڑایا تو ان پر خدا کا عذاب نازل ہوا اور یہ تباہ و برباد ہو گئیں- اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی انسان کے خیر و شر سے بے تعلق نہیں- دنیا میں جب کوئی قوم برائی کی حدود پھلانگ جاتی ہے تو اس کا قانون مکافات عمل حرکت میں آجاتا ہے اور اس قوم کو برباد کر دیا جاتا ہے- اللہ تعالی کے اسی قانون کے تقاضا کے طور پر آخرت میں بھی محاسبہ کا عمل ہوگا، جس کا مظاہرہ چھوٹے پیمانے پر اس دنیا میں کیا گیا ہے- قرآن مجید میں جن اقوام کی بدانجامی کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کے احوال کی کسی قدر تفصیل دینا مفید رہے گا-

قوم نوح

اقوام عالم کی تاریخ قوم نوح کے متعلق تقریباً خاموش ہے- اس میں صرف ایک ایسے طوفان کا ذکر ملتا ہے جو تقریباً چالیس ہزار سال قبل مسیح آیا جس میں ایک علاقہ غرقاب ہو گیا- صرف چند لوگ اپنی جان بچا کر فرار ہوئے جو دوسرے علاقوں میں جا کر آباد ہو گئے- ان میں حضرت نوحؑ کے علاوہ ان کے تین بیٹے حام، سام اور یافث بھی شامل تھے۔ ان کا چوتھا بیٹا کنعان طوفان میں غرق ہو گیا تھا- قرآن مجید نے قوم نوح کے ان واقعات کو مختصر طور پر بیان کیا ہے جو موعظت اور عبرت کے لیے ضروری تھے اور یہ بتایا ہے کہ حضرت نوح نے اپنی قوم کو ساڑھے نو سو سال تک خدائے واحد کی طرف بلایا لیکن وہ ان

کے پیغام کی تکذیب پر برابر اڑے رہے- بالآخر ان پر طوفان کی شکل میں خدا کا عذاب آیا جس میں یہ قوم غرق ہو گئی- صرف اہل ایمان بچائے گئے- ابن خلدون کے مطابق یہ طوفان 150 دن جاری رہا- طوفان کے بعد حضرت نوحؑ 350 برس زندہ رہے-

قوم نوح بت پرست قوم تھی- ان کے بتوں کے نام ود، یعوق، یغوث، سواع اور نسر تھے۔ ان میں ود اور سواع کا مرتبہ سب سے بلند تھا- بتوں کے یہ نام عربی ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ قوم نوح کا علاقہ شمالی حجاز تھا- ان کی جمعیت بہت زیادہ تھی- مال و اولاد کی کثرت تھی- ان کے علاقہ میں باغ اور ندیاں تھیں جن سے یہ اپنی زمینیں سیراب کرتے تھے- غلہ کی فراوانی تھی جس کی وجہ سے قوم بڑی خوشحال تھی- قوم نوح کا خیال تھا کہ ان کی خوشحالی ان کے دیوتاؤں کی وجہ سے ہے جن کی وہ پرستش کرتے اور جن کے لیے قربانی کرتے تھے- اپنی جمعیت کی کثرت، مال کی فراوانی اور خوشحالی کی بنا پر یہ لوگ بڑے متکبر اور جابر بن گئے- جب ان کی سرکشی بہت بڑھ گئی تو اللہ تعالی نے حضرت نوحؑ کو ان میں مبعوث کیا جنھوں نے ساڑھے نو سو سال تک بڑی دلسوزی سے انھیں خدا کی طرف بلایا لیکن یہ لوگ اس قدر مغرور اور سرکش تھے کہ وہ حضرت نوحؑ کی دعوت کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے اور اپنے گرد چادر لپیٹ کر رعونت سے چلے جاتے- آخر کار یہ قوم خدا کے عذاب کی زد میں آ کر تباہ و برباد ہو گئی- چنانچہ فرمایا:

مما خطیئتهم اغرقوا فادخلوا نارا فلم یجدوا لهم من دون الله انصارا (نوح: ۲۵)

(وہ اپنے گناہوں کی پاداش میں غرق کیے گئے پانی میں، پھر داخل کیے گئے آگ میں، پس اللہ کے مقابل میں انھوں نے کسی کو اپنا مددگار نہیں پایا)

قوم عاد

مورخین کے مطابق عاد کوئی محدود اور مختصر قبیلہ نہ تھا بلکہ وہ ایک عظیم الشان قوم تھی جو دنیا کی قدیم ترین تہذیب کی بانی ہے- عاد ارم، سام کی نسل سے تھے- ایشیا اور افریقہ کا کثیر حصہ ان کے زور و قوت کا تماشا گاہ تھا- ان کا مرکزی علاقہ ارض احقاف تھا- ان کی حکومت عرب کے بہترین حصہ حضر موت اور یمن نیز خلیج فارس کے سواحل سے حدود عراق تک وسیع تھی اور یمن ان کا دارالحکومت تھا- ان کا زمانہ تین ہزار سال قبل مسیح سے پہلے کا معلوم ہوتا ہے- قرآن مجید نے انھیں خلفائے قوم نوح

کہا ہے-انھیں پہاڑوں کو کاٹ کر شاندار عمارات کی تعمیر کا بڑا شوق تھا-اس فن میں انھیں بڑی مہارت حاصل تھی-اس لیے یہ عظیم الشان عمارات والے بھی کہلاتے ہیں-انھیں اپنی قوت بازو پر بڑا ناز تھا-دوسروں پر ظلم وجور ان کا شیوہ تھا-یہ اپنے مقبوضہ ممالک میں اکڑتے پھرتے تھے اور بغیر کسی وجہ کے دوسری قوموں کو چھیڑتے اور ان کے علاقوں پر قبضہ کر کے ان کو فنا کر رہے تھے-

عاد بت پرست تھے-انھوں نے اپنے دیوی دیوتا بنا لیے تھے-ان کے معبود بھی قوم نوح کی طرح ود، سُواع، یغوث اور نسر ہی تھے۔ ان کے علاوہ ان کے ایک بت کا نام صمود اور ایک کا نام تمار تھا-وہ اپنی تمام قوت وطاقت اور خوشحالی کا سبب ان ہی بتوں کو قرار دیتے تھے-انھوں نے پتھر اور لکڑی کے بت تراش رکھے تھے اور ان کی پرستش کرتے تھے-ان بتوں کو اپنا معبود مان کر ہر قسم کے شیطانی اعمال بے خوف وخطر کرنے لگے تھے-اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق اپنے رسول ہود علیہ السلام کو ان میں مبعوث کیا جنھوں نے ۵۰ برس تک وعظ کیا، ان کو توحید کی دعوت دی اور ظلم وجور سے منع کیا-مگر عاد نے ایک نہ سنی اور ہودؑ کو سختی سے جھٹلایا-وہ غرور وتکبر سے کہنے لگے کہ آج دنیا میں ہم سے زیادہ شوکت وجبروت کا مالک کون ہے-انھوں نے حضرت ہودؑ سے صاف کہہ دیا کہ ہم اس ڈھونگ میں آنے والے نہیں کہ تمھیں خدا کا رسول مان لیں اور اپنے خداؤں کی عبادت چھوڑ کر یہ یقین کر لیں کہ وہ خدائے اکبر کے سامنے ہمارے سفارشی نہیں ہوں گے-وہ حضرت ہودؑ کی تکذیب اور تذلیل کے درپے ہو گئے اور مجنون اور خبطی کہہ کر ان کا مذاق اڑانے لگے-اتمام حجت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان پر باد صرصر چلا دی جو سات رات اور آٹھ دن چلتی رہی۔ ان کی بلند وبالا عمارات سب تباہ وبرباد ہو گئیں، ان کے باغ وچمن اجڑ گئے، کھیت ویران ہو گئے اور خود وہ کھجور کے کھوکھلے تنے کے مانند ہو گئے-سورہ الحاقہ میں فرمایا:

واما عاد فاهلكوا بريح صرصر عاتية سخرها عليهم سبع ليال و ثمانية ايام حسوما فترى القوم فيها صرعىٰ كانهم اعجاز نخل خاوية فهل ترى لهم من باقيه-(الحاقہ: ۸-۵)

(رہے عاد تو وہ ایک بے قابو باد تند سے برباد ہوئے-اس کو اللہ نے سات رات اور آٹھ دن ان کی بیخ کنی کے لیے ان پر مسلط رکھا-تم دیکھتے ہو کہ وہ وہاں اس طرح پچھاڑے پڑے ہیں گویا کہ کھجوروں کے کھوکھلے تنے ہوں-تو کیا تم دیکھتے ہو ان میں سے کوئی بچ رہنے والا)

قوم ثمود

ثمود عاد کے بقایا میں سے تھے اس لیے ان کو عاد ثانی بھی کہا جاتا ہے-عاد کے بعد سیاسی جانشینی ثمود کو حاصل ہوئی-عاد پر جو عذاب آیا اس میں حضرت ہودؑ اور ان پر ایمان لانے والے بچا لیے گئے-حضرت ہودؑ انھیں لے کر مغربی اور شمالی عرب میں آباد ہو گئے-اس زمانہ میں اس کا نام وادی القریٰ تھا-اب اس کو مدائن صالح کہتے ہیں-یہ لوگ بھی عاد کی طرح فن تعمیر کے ماہر تھے-پہاڑوں کو کاٹ کر اور پتھروں کو تراش کر مکانات اور محلات تعمیر کرتے تھے۔ یہ مقابر بھی پتھروں کے بناتے تھے-ابتدا میں یہ خدا پرست تھے لیکن حضرت ہودؑ کے بعد جنھوں نے ۱۵۰ برس کی عمر پائی، یہ لوگ بھی رفتہ رفتہ کواکب پرستی کی طرف مائل ہو گئے اور ان کی پرستش کے لیے عالی شان ہیکل تعمیر کیے-

قوم ثمود بڑی خوشحال قوم تھی۔ ان کے ہاں سیم وزر کی بہتات تھی، بلند وبالا عالی شان محلات تھے-میووں اور پھلوں اور عمدہ مرغزاروں کی کثرت تھی-اپنی اس خوشحالی، شوکت وجبروت کی وجہ سے یہ متکبر ہو گئے-اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق ان کی اصلاح کے لیے حضرت صالحؑ کو مبعوث کیا جنھوں نے انھیں توحید کی دعوت دی-انھوں نے حضرت صالحؑ کا مذاق اڑایا اور کہا کہ تمہارے پیرو تنگ حال اور غریب ہیں جبکہ ہم خوشحال ہیں اور ہمیں ہر نعمت حاصل ہے-اس لیے تو سچا ہے یا ہم-حضرت صالحؑ نے انھیں سمجھایا کہ رفاہیت اور پر تعیش زندگی پر شیخی نہ بگھارو اور اگر تمہارے کبر وغرور اور عناد کا یہی حال رہا تو پل بھر میں یہ سب کچھ فنا ہو جائے گا-یہ اللہ کے رسول کی تکذیب میں اس حد تک بڑھ گئے کہ اس اونٹنی کی بھی کونچیں کاٹ دیں جس کو حضرت صالحؑ نے عذاب کی نشانی کے طور پر چھوڑا تھا۔ اس کے بعد بھی انھیں تین دن کی مہلت دی گئی جس سے انھوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا-آخر کار خدا کے عذاب نے انھیں پکڑ لیا-اس قوم پر اللہ تعالیٰ نے سرمائی باد صرصر اور کڑک دمک اور زلزلہ کا عذاب بھیجا-نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گھروں میں اوندھے منہ پڑے کے پڑے رہ گئے-اور ایسے بے نام ونشان ہوئے گویا کبھی ان میں بسے ہی نہیں تھے-قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ- اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ- وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ- كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا- اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ- اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ-(ہود: ۶۸-۶۶)

(پس جب ہمارا حکم صادر ہوا تو ہم نے صالحؑ کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنے خاص فضل سے اس عذاب اور اس دن کی رسوائی سے نجات بخشی۔ بے شک تمہارا رب ہی قوی اور غالب ہے، اور ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا خدا کی ڈانٹ نے آپکڑا اور وہ اپنے گھروں میں زمین سے چپٹے پڑے رہ گئے۔ گویا کبھی ان میں بسے ہی نہیں۔ سن لو ثمود نے اپنے رب کی ناشکری کی۔ سن لو کہ ہلاکی ہو ثمود کے لیے)

قوم لوط

اردن کے قریب جہاں آج بحر مردار واقع ہے وہاں کسی زمانہ میں سدوم اور عامورہ کی بستیاں تھیں جہاں قوم لوط آباد تھی۔ یہ مقام شروع میں سمندر نہیں تھا بلکہ جب اس قوم پر عذاب آیا تو اس سر زمین کا تختہ الٹ دیا گیا۔ بعد ازاں زلزلوں سے یہ سرزمین سمندر سے نیچے چلی گئی اور پانی اوپر آ گیا۔ اس وجہ سے اس کا نام بحر مردار یا بحر لوط پڑ گیا۔ مورخین کے مطابق دنیا کی کوئی برائی ایسی نہ تھی جو اس قوم میں موجود نہ ہو۔ یہ لوگ باہر سے آنے والے تاجروں اور سوداگروں کا مال لوٹ لیا کرتے تھے۔ ان میں ظلم و ستم، فحاشی، بد اخلاقی عام تھی۔ یہ لوگ فسق و فجور میں دھنسے ہوئے تھے۔ دنیا کی سرکش، متمرد، بد اخلاق و بد اطوار اقوام کے تمام عیوب و فواحش کے علاوہ یہ قوم ایک خبیث عمل کی موجد تھی۔ یہ لوگ اپنی حیوانی خواہشات کو عورت کی بجائے لڑکوں سے پورا کرتے تھے۔ یہ لوگ بت پرست، ستارہ پرست اور آفتاب پرست تھے۔ یہ بھی بڑی خوشحال قوم تھی۔ ان کی سرزمین سرسبز و شاداب تھی۔ غلوں، پھلوں اور میووں کی افراط تھی جس سے ان میں تکبر پیدا ہو گیا تھا۔ دوسری قوموں کی طرح یہ بھی اپنی رفاہیت کو دیوی دیوتاؤں کی عبادت کا مرہون منت قرار دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے حضرت لوط علیہ السلام کو مبعوث کیا جو حضرت ابراہیمؑ کے برادر زادہ اور ان ہی کے ساتھ ہجرت کر کے آئے تھے۔ حضرت لوطؑ نے ان کو خدائے واحد کی عبادت کی دعوت دی، ان کی خباثتوں اور بے حیائیوں پر ملامت کی اور پاکبازی کی زندگی گزارنے کی طرف بلایا۔ انہیں سمجھایا کہ پہلی اقوام بھی اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے تباہ ہوئیں۔ اس پر انہوں نے اپنے رسول کا مذاق اڑایا اور کہا کہ یہ اگر بڑے پاکباز ہیں تو ان کا ہماری بستی میں کیا کام۔ اگر ہم ناپاک اور بے حیا ہیں تو ان پاکبازوں کو بستی سے نکالو۔ دوسری قوموں کی طرح انہوں نے بھی حضرت لوطؑ سے مطالبہ کیا کہ جس عذاب سے تم ڈراتے ہو اس کو لا کر

دکھاؤ۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے تین فرشتوں کو خوبصورت لڑکوں کی شکل میں عذاب کا کوڑا دے کر بھیج دیا۔ اس بدبخت قوم نے ان فرشتوں پر بھی ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے ان کی بستی کو الٹ دیا۔ ارشاد ہوا:

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ۔ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ۔ (ھود: ۸۲-۸۳)

(پس جب آیا ہمارا عذاب تو ہم نے اس بستی کو یک قلم تلپٹ کر کے رکھ دیا اور اس پر سنگ گل کی بارش کی، تہ بہ تہ، تمہارے رب کے پاس نشانیاں لگائے ہوئے اور وہ ان ظالموں سے کچھ دور نہیں)

اہل مدین

حضرت ابراہیمؑ کی تیسری بیوی قطورا کے بیٹے مدین 2000 قبل مسیح میں بحر قلزم کے مشرقی کنارہ پر رقیم میں آباد ہوئے جو شام اور خلیج عقبہ کے درمیان واقع ہے۔ اس کی سرحدیں حجاز سے ملتی تھیں۔ حجاز سے شام، فلسطین اور مصر جانے والے تجارتی قافلوں کے راستہ میں تبوک کے قریب اس بستی کے کھنڈر پڑتے ہیں۔ اہل مدین بتوں کی پرستش اور ان کے لیے قربانی کرتے تھے۔ ان کے بتوں کے سردار کا نام 'لاحل فغور' تھا۔ یہ قوم بڑی خوشحال تھی۔ آب و ہوا کی لطافت اور پانی کی کثرت نے اس مقام کو بہت سرسبز و شاداب اور پر فضا بنا دیا تھا۔ یہاں میووں، پھلوں اور خوشبودار پھولوں کے بے شمار باغات اور چمن تھے۔ غلہ افراط سے پیدا ہوتا تھا۔ تجارتی شاہراہ پر آباد ہونے کے باعث اہل مدین کا خاص پیشہ تجارت تھا۔ لیکن ان کی تجارت بے ایمانی، فریب اور بد دیانتی پر مبنی تھی۔ ان کی غالب ترین برائی جس کا قرآن مجید میں بھی ذکر ہوا ہے، یہ تھی کہ یہ لوگ جب مال خریدتے تو پورا لیتے اور جب فروخت کرتے تو کم تولتے۔ اس کے لیے انہوں نے الگ الگ ترازو رکھے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے ہاں تجارتی سودوں پر سود، بٹہ اور دوسرے طریقے بھی رائج تھے جس سے وہ اپنا حق تو پورا وصول کرتے اور دوسروں کے حق میں سے بھی کچھ مار لیتے۔ یہ ایسی معاشی برائی تھی جس نے سارا معاشی نظام درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ جب ان کی سرکشی بہت بڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو ان میں مبعوث کیا۔ حضرت شعیبؑ بڑے فصیح و بلیغ مقرر تھے۔ شیریں کلامی، حسن خطابت، طرز بیان اور طلاقت لسانی میں بہت نمایاں امتیاز رکھتے تھے۔ اسی لیے وہ "خطیب الانبیاء" بھی کہلاتے ہیں۔ انہوں نے اپنا سارا زور بیان

اپنی قوم کو راہ حق پر لانے کے لیے صرف کر دیا مگر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا- صرف چند ضعیف اور کمزور لوگوں کے سوا کسی نے پیغام حق پر کان نہ دھرا- اہل مدین خود بھی گمراہ رہے اور دوسروں کے قبول حق کی راہ میں بھی مانع رہے- وہ راستوں میں بیٹھ جاتے اور حضرت شعیبؑ کے پاس آنے جانے والوں کو قبول حق سے روکتے اور اگر موقع ہاتھ آجاتا تو ان کو لوٹ لیتے- پھر بھی اگر کوئی حق پر لبیک کہتا تو اس کو ڈراتے دھمکاتے- لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حضرت شعیبؑ نے رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا تو انہوں نے تنگ آکر حضرت شعیب سے کہا کہ دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہو کر رہے گی- یا ہم تم کو اور تیرے ساتھیوں کو بستی سے نکال دیں گے یا تم کو مجبور کریں گے کہ پھر ہمارے دین میں واپس آجاؤ- یہ لوگ حضرت شعیبؑ سے کہتے کہ کیا ہم اپنے باپ دادا کے دیوتاؤں کو پوجنا چھوڑ دیں اور ہم کو اپنے مال و دولت پر یہ اختیار نہ رہے کہ ہم جس طرح چاہیں اس کو صرف کریں- اگر ہم کم تولنا چھوڑ دیں، لوگوں کے کاروبار میں کھوٹ نہ کریں تو مفلس اور قلاش ہو جائیں گے- دوسری قوموں کی طرح انہیں بھی اپنی خوشحالی پر بڑا ناز تھا اور یہ حضرت شعیب سے کہتے کہ تو اور تیرے ساتھی ہم سب سے کمزور اور غریب ہیں- اگر تیری باتیں سچی ہوتیں تو تیری زندگی ہم سے اچھی ہوتی- ہم کو صرف تیرے خاندان کا خوف ہے ورنہ تجھ کو سنگسار کر دیتے- ان کی نافرمانی اور سرکشی کی پاداش میں انہیں دو قسم کے عذاب نے آگھیرا- ایک زلزلہ کا عذاب اور دوسرا آگ اور بارش کا عذاب یعنی جب وہ گھروں میں آرام کر رہے تھے تو یک بیک ایک ہولناک زلزلہ آیا اور ابھی اس کی ہولناکی ختم نہ ہوئی تھی کہ بادل کڑکنے لگے اور بستی پر بجلی گر پڑی- بارش نے ان کو گھیر لیا- صبح کو یہ سرکش اور مغرور اپنے گھروں میں اوندھے اور جھلسے ہوئے پڑے تھے- سورہ ھود میں فرمایا:

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ اَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ- كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ-

(ھود: ۹۵-۹۴)

(اور جب ہمارا عذاب آیا ہم نے شعیب کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے اپنی رحمت سے نجات دی اور جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ان کو ڈانٹ نے آپکڑا، پس وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے، گویا کبھی ان میں بسے ہی نہیں تھے- ہاں ہلاک ہوئے مدین جس طرح دفع ہوئے ثمود!)

قوم فرعون

فرعون شاہان مصر کا لقب ہے- تین ہزار سال قبل مسیح سے عہد سکندر تک فراعنہ کے اکتیس خاندان مصر پر حکمران رہے- حضرت موسیٰ کے زمانہ میں فرعون رعمسیس ثانی حکمران تھا- بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس کا بیٹا منفتاح حکمران تھا جس کا دور حکومت ۱۲۹۳ ق-م سے شروع ہو کر ۱۲۲۵ ق-م پر تمام ہوتا ہے- فرعون سب سے بڑے دیوتا سورج کا اوتار سمجھا جاتا تھا اور وہ خود کو رب اعلیٰ کہتا تھا- ملک میں جگہ جگہ اس کے مجسمے نصب تھے اور اس کی پرستش ہوتی تھی- ملک بڑا خوشحال تھا- اس کا ایک وزیر ہامان تھا جو فن تعمیر کا ماہر سمجھا جاتا تھا- اس نے ملک میں بڑی پر شکوہ اور بلند و بالا عمارات تعمیر کرائی تھیں- اسرائیلیوں کو، جو حضرت موسیٰ کے قبیلہ کے لوگ تھے، مصریوں نے غلام بنا رکھا تھا- ان کی بستیاں شہر سے الگ تھیں- ان سے بیگار لی جاتی تھی- اوپلے تھاپنے، اینٹیں بنانے سے لے کر زراعت اور تعمیرات کے تمام کام ان ہی کی مشقت سے انجام پاتے تھے- مصریوں کو بھی اجازت تھی کہ وہ بنی اسرائیل سے غلاموں کی طرح کام لیں- اسرائیلیوں کی مقدار جب زیادہ ہو گئی تو فرعون کو خطرہ پیدا ہوا کہ یہ کہیں ان کے ملک پر ہی قابض نہ ہو جائیں- اس کے سدباب کے لیے اس نے ان کی مشقت سخت سے سخت تر کر دی- پھر اس نے ایک نئی اسکیم بنائی جس کے تحت اس نے عبرانی دائیوں کو حکم دیا کہ تم پچے جناؤ- اگر بیٹا ہو تو اس کو مار ڈالو اور اگر بیٹی ہو تو اس کو جیتی رہنے دو- دائیوں کے عدم تعاون سے یہ اسکیم ناکام ہو گئی- پھر اس نے عام لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اسرائیلیوں کے بچوں کو دریا میں پھینک دیا کریں- ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قوم فرعون کی طرف رسول بنا کر بھیجا- وہ فرعون ہی کے محل میں پروان چڑھے تھے- ان کے ساتھ ان کے بڑے بھائی حضرت ہارون کو ان کا وزیر بنا کر بھیجا گیا جو نہایت فصیح البیان اور بلند پایہ خطیب تھے- اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو دو معجزے عصا اور ید بیضا بھی عطا کیے - مصر میں سحر و ساحری کا بڑا زور تھا لیکن حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں جادوگروں کو عبرتناک شکست ہوئی- حضرت موسیٰ کی لٹھیا نے اژدھا بن کر جادوگروں کی رسیوں کو جو فریب نظر سے سانپ معلوم ہوتی تھیں نگل لیا- اس کے بعد ساحر ایمان لے آئے- لیکن فرعون نے شکست نہ مانی اور جادوگروں کے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹنے کا حکم دیا- اس کے باوجود جادوگر اپنے ایمان پر قائم رہے- حضرت موسیٰ نے فرعون سے بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ شہر سے باہر لے جانے کی اجازت مانگی تاکہ وہ عید منا سکیں اور قربانی کر سکیں- فرعون اس پر رضامند نہ ہوا بلکہ اسرائیلیوں پر اس

کی ستم رانیوں میں برابر اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے قوم فرعون پر تنبیہی آفات بھی بھیجیں۔ پہلے ان پر رعد گرج، کڑک اور اولوں کا طوفان بھیجا گیا۔ اس کے بعد ٹڈیوں کی آفت نازل ہوئی، پروا ہوائیں اتنی کثیر مقدار میں ٹڈیاں لے آئیں کہ زمین پر اندھیرا چھا گیا۔ اولوں سے جو سبزہ اور درخت بچ رہے تھے ان ٹڈیوں نے ان سب کو چٹ کر لیا۔ اس کے بعد جوؤں کی آفت نازل ہوئی۔ حضرت موسیٰ نے زمین کی گرد پر جب اپنی لاٹھی ماری تو انسانوں اور حیوانوں پر جوئیں ہی جوئیں ہو گئیں۔ اس کے بعد مینڈکوں کی آفت آئی۔ تنوروں، آٹا گوندھے کے مٹکوں، گھروں، پلنگوں پر مینڈک ہی مینڈک ہو گئے۔ سب سے بعد میں خون کی آفت آئی۔ دریاؤں، نہروں اور جھیلوں میں خون ہی خون ہو گیا۔ اس قوم پر جب بھی کوئی آفت آتی یہ حضرت موسیٰ کی منت سماجت کرتے کہ تم اپنے رب سے دعا کرو کہ یہ آفت دور ہو جائے۔ اگر تم نے اس کو دور کر دیا تو ہم ضرور تمھاری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو ضرور تمھارے ساتھ جانے دیں گے۔ لیکن جب حضرت موسیٰ کی دعا سے یہ آفت ٹل جاتی تو یہ مکر جاتے۔ فرعون اور اس کے درباری جب روز روز کی نت نئی آفت سے تنگ آ گئے تو فرعون نے درباریوں کے مشورے سے بنی اسرائیل کو جانے کی اجازت دے دی۔ حضرت موسیٰ اپنی قوم کو لے کر جب نکل گئے تو فرعون کو خیال آیا کہ اب ان کے کام کون کرے گا۔ ان کے کھیت کیسے سیراب ہوں گے اور ان کے لیے مشقت کون کرے گا۔ اس لیے وہ اپنے فیصلہ پر بہت پچھتایا اور فوج لے کر حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ حضرت موسیٰ جب اسرائیلیوں کے ساتھ خلیج عقبہ پر پہنچے تو فرعون کی فوج نے ان کو جا لیا۔ موسیٰ کی قوم سخت پریشان ہوئی کیونکہ ان کے آگے سمندر تھا اور پیچھے فرعون کی فوج۔ حضرت موسیٰ نے انھیں تسلی دی اور خدا کے حکم سے سمندر پر لاٹھی ماری جس سے سمندر کا پانی سمٹ گیا اور سمندر میں راستہ بن گیا۔ حضرت موسیٰ اپنی قوم کو لے کر سمندر کے پار پہنچ گئے۔ فرعون نے بھی اسی راستے سے گزرنے کی کوشش کی لیکن جب وہ سمندر کے بیچ میں پہنچا تو سمندر کا پانی مل گیا جس میں فرعون اور اس کی فوج غرق ہو گئی اور وہ اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچ گیا۔ سورۃ الشعراء میں فرمایا:

فَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْبَحْرَ – فَانْفَلَقَ فَکَانَ کُلُّ فِرْقٍ کَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ – وَ اَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِیْنَ – وَ اَنْجَیْنَا مُوْسٰی وَ مَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِیْنَ – ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِیْنَ –

(شعراء: ۶۳-۶۶)

(پس ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ اپنا عصا دریا پر مارو۔ پس وہ پھٹ گیا اور ہر حصہ ایک عظیم تودے کی مانند بن گیا اور ہم قریب لائے وہیں دوسروں کو اور ہم نے موسیٰ اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو نجات دی۔ پھر دوسروں کو غرق کر دیا)

اس کے ساتھ ہی مصر پر رعد و برق اور زلزلہ کا عذاب آیا جس نے مصر کی تمام تعمیرات اور اس کے سارے باغ و چمن تاراج کر دیے۔ فرمایا:

وَدَمَّرْنَا مَا کَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَمَا کَانُوْا یَعْرِشُوْنَ– (الاعراف: ۷: ۱۳۷)

(اور ہم نے تاراج کر دیے وہ سب کچھ جو فرعون اور اس کی قوم کے لوگ بناتے رہتے تھے اور ان کے انگوروں کے وہ باغ بھی جن کو وہ ٹٹیوں پر چڑھاتے تھے)

معذب قوموں کے مندرجہ بالا اجمالی واقعات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جب ان قوموں کی اخلاقی حالت انتہائی پست ہو گئی اور وہ تکبر میں مبتلا ہو گئے انھوں نے توحید کی راہ چھوڑ کر شرک کی راہ اختیار کر لی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے رسول بھیجے جو ایک عرصہ تک انھیں حق کی طرف بلاتے رہے لیکن انھوں نے نہ صرف رسول کی تکذیب کر دی بلکہ ان کے درپے آزار بھی ہو گئے۔ آخر کار انھیں اللہ تعالیٰ کے عذاب نے پکڑ لیا اور وہ فنا کر دیے گئے۔ ان قوموں پر عذابوں کی جو تفصیل قرآن مجید میں دی گئی ہے اس کے مطابق قوم نوح پر طوفان کا عذاب آیا۔ عاد، ثمود اور مدین پر صیحہ کا عذاب نازل ہوا۔ قارون کو زمین میں دھنسا دیا گیا اور فرعون اور ہامان سمندر میں غرق کر دیے گئے۔

معذب قوموں کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا میں قوموں کا عزل و نصب اتفاقاً نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی کسوٹی پر جانچ کر جس قوم کو اہل پاتا ہے اس کو عروج عطا کر دیتا ہے اور جب وہ اخلاقی عناصر سے خالی ہو جاتی ہے تو اس کو فنا کر کے ایسی قوم کو لاتا ہے جو کردار میں اس سے بہتر ہوتی ہے۔ یہاں بھی خدا کا قانون مکافات ہی حرکت میں ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا دنیا کے خیر و شر سے بے تعلق نہیں ہوتا۔

افراد کا معاملہ

ایک قوم کے ساتھ جو معاملہ ہوتا ہے اس میں افراد اپنی انفرادی حیثیت سے زیر بحث نہیں آتے۔ یہ معاملہ قوم سے من حیث القوم ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ قوم کے کچھ لوگ نیک بھی رہے ہوں لیکن جب قوم فنا ہوتی ہے تو وہ بھی بے آبرو ہو جاتے ہیں۔ لیکن عقل و انصاف کا تقاضا ہے کہ انھیں

نیکی کا صلہ تو ملنا چاہیے۔ اسی طرح ایک قوم اپنی نیکیوں کی بدولت عروج پاتی ہے لیکن اس کے اندر برے افراد بھی تو ہوتے ہیں ان کو سزا ملنا عدل کا تقاضا ہے۔ اس لیے افراد کا معاملہ اور قوم کا معاملہ ایک ساتھ طے نہیں ہو سکتا۔ افراد کے محاسبہ کے لیے ضروری ہے کہ تمام اولین و آخرین، تمام صغیر و کبیر اور زمین و آسمان سب کے سب جمع ہوں اور ان کی شہادت کے مطابق اللہ تعالیٰ ہر فرد کے بارے میں فیصلہ فرمائے اور اگر وہ اجر کا مستحق ہو تو اس کو اجر دے اور اگر اس کے اعمال سزا کے متقاضی ہوں تو اس کو سزا دے۔ پس قیامت کا واقع ہونا قانون مکافات کا لازمی تقاضا ہے۔

یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب قوموں کا فیصلہ اس دنیا میں کر دیا جاتا ہے تو افراد کا معاملہ اسی دنیا میں کیوں نہیں طے کر دیا جاتا اور اس کے لیے کیا ضروری ہے کہ پوری دنیا ایک معین مدت کے بعد ختم ہو جائے۔ یہ کیوں ممکن نہیں کہ دنیا ابد قائم بھی رہے اور جو مرتے جائیں ان کی عدالت بھی ہوتی رہے۔ دراصل معاملہ یوں ہے کہ انسان کا ہر عمل' خواہ نیکی کا عمل ہو یا بدی کا' اپنے اندر متعدی ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایک شخص نیکی کا بیج بوتا ہے جس کی برکت سے صدیوں اور قرنوں تک اولاد آدم مستفید ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک شخص ایک غلط اور گمراہ کن فلسفہ ایجاد کرتا ہے جس کی ضلالت ایک خلق کثیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور وہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اتنی مستحکم ہوتی جاتی ہے کہ اس کو اکھاڑنا تو در کنار قوموں کے بعد قومیں اٹھتی ہیں اور اپنی صلاحیتیں اس کو پروان چڑھانے پر صرف کرتی ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر کسی نیکی یا بدی کے اثرات کا صحیح اندازہ کسی شخص کو کرانا ہو تو یہ ضروری ہو گا کہ اس کے عمل کے بعید سے بعید اثرات اس کے سامنے لائے جائیں۔ اور عناصر کائنات میں سے جو بھی اس کی نیکی یا بدی کے گواہ ہوں ان کو بھی پیش کیا جائے۔ اس کے بغیر کامل عدل ظہور میں نہیں آ سکتا۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ خالق کائنات اس کائنات کی بساط ایک دن لپیٹ دے اور تمام انسانوں کا روز انصاف ایک ہی ہو۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ دنیا ہماری زندگی کا وہ حصہ ہے جو ہمیں نظر آتا ہے۔ اس کا بڑا حصہ آخرت کے پردہ میں ہے۔ محض سامنے کے حصہ کو پیش نظر رکھ کر اس کائنات کی صحیح توجیہ ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ چونکہ دونوں جہانوں کا علم رکھتا ہے اس لیے اس نے دنیا اور آخرت کی چول سے چول ملا کر دکھا دیا ہے کہ یہ دنیا جب آخرت سے ملتی ہے تب وہ ایک حسین وحدت بنتی ہے اور تب یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی یہ دنیا ایک عادل، رحیم، کریم، مدبر اور حکیم کا بنایا ہوا ایک با مقصد کارخانہ ہے۔ (جاری ہے)

تالیفات امام حمید الدین فراہیؒ

		روپے پیسے
1۔	مجموعہ تفاسیر فراہی	328 - 00
2۔	حکمت قرآن	84 - 00

تالیفات مولانا امین احسن اصلاحیؒ

1۔	تدبر قرآن کامل۔ (9 جلد)	2,952 - 00
	(فی جلد):	328 - 00
2۔	مبادی تدبر قرآن	105 - 00
3۔	مبادی تدبر حدیث	90 - 00
4۔	حقیقت شرک و توحید	144 - 00
5۔	حقیقت نماز	54 - 00
6۔	حقیقت تقویٰ	54 - 00
7۔	تزکیہ نفس: جلد دوم	105 - 00
8۔	دعوت دین اور اس کا طریق کار	105 - 00
9۔	اسلامی قانون کی تدوین	78 - 00
10۔	اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل	78 - 00
11۔	اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام	105 - 00
12۔	قرآن میں پردے کے احکام	12 - 00
13۔	فلسفے کے بنیادی مسائل۔ قرآن حکیم کی روشنی میں	120 - 00
14۔	تفہیم دین	90 - 00
15۔	مقالات اصلاحی: جلد اول	165 - 00

فاران فاؤنڈیشن

122۔ فیروز پور روڈ' اچھرہ' لاہور۔ 54600۔ پاکستان

فون ۔ 7595200